www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

December 2004 • No. 337

الرسالہ، دسمبر 2004

ڈرواس سے جو وقت ہے آنے والا

۲۵ جولائی ۲۰۰۴ کا واقعہ ہے۔ صبح کے وقت میں دہلی میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ پاس کے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر میں نے اپنا ریڈیو کھولا تو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی کے صبح کے نشریہ میں ایک مذہبی گیت سنائی دینے لگا۔ اس کی ایک لائن یہ تھی:

سجن رے جھوٹ مت بولو خدا کے پاس جانا ہے نہ ہاتھی ہے نہ گھوڑا ہے وہاں پیدل ہی جانا ہے

اس تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ ریڈیو کا گیت اور چڑیوں کا نغمہ دونوں ایک ہیں۔ گویا کہ ریڈیو اسی حقیقت کا اعلان ملفوظ زبان میں کر رہا ہے جس کا اعلان اس سے پہلے چڑیاں غیر ملفوظ زبان میں کر رہی تھیں۔ دونوں کا پیغام ایک ہے — اے انسان، تو جس دنیا میں ہے وہ خدا کی دنیا ہے۔ تیری کامیابی کا راز یہ ہے کہ تو اس بنیادی حقیقت کو جانے اور اپنی زندگی کو اس حقیقت کے مطابق ڈھال لے۔

زندگی امتحان کی ایک مدت ہے اور موت اس مدت امتحان کا خاتمہ۔ موت گویا مالک کائنات کی طرف سے انسان کی گرفتاری ہے۔ موت کے بعد ہر عورت اور مرد خدا کی عدالت میں پہنچا دیے جاتے ہیں تاکہ وہ وہاں اپنے قول و عمل کا حساب دیں۔ اسی حساب کی بنیاد پر ہر عورت اور مرد کے مستقبل کا فیصلہ کیا جانا ہے۔ خدا کے حکم پر چلنے والوں کے لیے جنت کا فیصلہ، اور خدا کے حکم کے خلاف چلنے والوں کے لیے جہنم کا فیصلہ۔

لوگ ہر سال اپنا برتھ ڈے مناتے ہیں۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ایک اور سال پورا ہو گیا۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ ہر سال اپنا ڈِتھ ڈے منائیں۔ وہ ہر سال یاد کریں کہ ان کی مقرر زندگی کا ایک اور سال کم ہو گیا۔ اس دنیا میں ہر عورت اور مرد ایک محدود مدت کے لیے آتے ہیں — پچاس سال، توّے سال، بہت سے بہت سو سال۔ اس کے بعد ہر ایک کے لیے مقدر ہے کہ وہ اپنی عمر کی طے شدہ مدت پوری کر کے مر جائے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو ہر عورت اور ہر مرد کا مسلسل کاؤنٹ ڈاؤن ہو رہا ہے۔ ہر نیا سال جب آتا ہے تو وہ ہر عورت اور ہر مرد کی عمر کا ایک سال اور کم کر دیتا ہے۔

موت ایک ایسا آنے والا واقعہ ہے جو ہر ایک پر آتا ہے۔ موت ایک چیتاونی ہے، وہ یاد دلاتی ہے کہ آخر کار ہر عورت اور مرد کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ خدا کی عدالت میں حاضری کی مدت بہت قریب ہے۔ موت ہر ایک کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اے سونے والو، جاگ اٹھو، اور اے جاگنے والو، ہوشیار ہو جاؤ۔ تم جلد ہی خدا کی کائناتی عدالت میں حاضر کئے جانے والے ہو۔ اس آنے والے بڑے دن کی تیاری کرو۔

ہر صبح کو جب آسمان پر سورج طلوع ہوتا ہے تو گویا کہ خدا اپنی کائناتی ٹارچ کو جلا کر انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ خدا ہر عورت اور ہر مرد کو دیکھ رہا ہے۔ بولنے والوں نے کیا بولا اور چلنے والے کس راہ پر چلے، کسی عورت یا مرد کو خدا نے جو کچھ دیا ہے اس نے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ ہر چیز سے خدا پوری طرح آگاہ ہے۔

یہ صورت حال پکار کر ہر عورت اور ہر مرد سے کہہ رہی ہے کہ تم جب سوچو تو یہ دھیان میں رکھ کر سوچو کہ خدا تمہاری سوچ تک کو جانتا ہے۔ جب تم بولو تو یہ سوچ کر بولو کہ تمہارے الفاظ دوسرے انسان تک پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہے ہیں۔ جب تم کوئی کام کرو تو یہ سمجھ کر کرو کہ تمہارا ہر کام خدا کی نظر میں ہے اور ہر کام پر تم کو خدا کی طرف سے سزا یا انعام ملنے والا ہے۔

ہر پیدا ہونے والی عورت اور ہر پیدا ہونے والے مرد پر لازم ہے کہ وہ خدا رخی زندگی (God-oriented life) کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وہ وقتی خواہشوں سے بلند ہو اور وہ روش اختیار کرے جو اس کے ابدی مستقبل کے لیے کارآمد ہو۔

ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کو پہچانے۔ وہ خدا کی خدائی کا اقرار کرے۔ وہ خدا کے آگے پوری طرح جھک جائے۔ وہ خدا کا کامل پرستار بنے۔ وہ اپنے دماغ کو برے خیالات سے پاک کرے۔ وہ لوگوں کا خیر خواہ بنے نہ کہ بدخواہ۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرے۔ وہ ایسے مال کو اپنے لیے حرام سمجھے جو جائز طور پر اس کا حق نہیں۔ اس کو کوئی عہدہ ملے تو اس عہدہ کو وہ ایک ذمہ داری سمجھے نہ کہ ایک اعزاز۔ وہ نفرت اور تشدد سے پوری طرح اپنے آپ

کو بچائے۔ وہ حسد اور بغض اور کینہ کو اپنے لیے ہلاکت سمجھے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح انجام دے۔ وہ اپنے سماج کا ایک پر امن شہری بنے۔ وہ دوسروں کی مدد کرنے والا ہو۔ وہ جب بھی بولے اور جب بھی کوئی کام کرے تو یہ سوچ کر بولے یا کرے کہ اس کا یہ عمل خدا کی پسند کے مطابق ہے یا خدا کی پسند کے خلاف۔ اس کا ضمیر جس کام کو خدا کی پسند کا کام بتائے اس کو وہ اپنا لے اور جس کام کو اس کا ضمیر خدا کی پسند کے خلاف بتائے اس سے وہ اسی طرح بچے جس طرح کوئی شخص آگ سے بچتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور ہر مرد کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک جہنم کا راستہ اور دوسرا جنت کا راستہ۔ جو آدمی اپنی خواہشوں کے پیچھے چلے وہ گویا جہنم کی طرف جا رہا ہے اور جو آدمی خدا کے حکم اور اپنے ضمیر کی رہنمائی میں چلے وہ جنت کی طرف جا رہا ہے۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ وقتی فائدے کے بجائے ابدی فائدے کو سامنے رکھے اور وقتی مفاد کے بجائے ابدی کامیابی کے لیے عمل کرے۔ ہر عورت اور ہر مرد کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ خالق کے تخلیقی نقشہ کو جانے تا کہ اس کے مطابق وہ اپنی زندگی کی درست منصوبہ بندی کر سکے۔ تا کہ وہ بھٹکے بغیر اپنی حقیقی منزل تک پہنچ جائے۔

انسانی زندگی کی مثال آئس برگ جیسی ہے۔ اس کا بہت چھوٹا حصہ (ٹپ) آج کی دنیا میں دکھائی دیتا ہے اور اس کا بہت بڑا حصہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کو پیدا کرنے والے نے انسان کو ایک ابدی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اور پھر اس کی عمر کے بہت چھوٹے حصہ کو موجودہ دنیا میں رکھا اور اس کے بڑے حصہ کو اگلی دنیا میں رکھ دیا۔ اور پھر اس کے لیے مقدر کر دیا کہ وہ اپنی زندگی کے امتحانی حصہ کو موجودہ مختصر دنیا میں گزارے اور اپنی بقیہ طویل عمر گزارنے کے لیے موت کے بعد اگلی دنیا میں پہنچا دیا جائے۔

موجودہ دنیا کیا ہے اور اگلی دنیا کیا۔ موجودہ دنیا ناقص دنیا ہے اور اگلی دنیا کامل دنیا۔ موجودہ دنیا انسان کے لیے ٹسٹ کی جگہ ہے اور اگلی دنیا ٹسٹ میں پورا اترنے کی صورت میں انعام پانے کی جگہ۔

اگلی دنیا میں خدا نے ایک معیاری دنیا بنائی اسی کا نام جنت ہے۔ موجودہ دنیا اس معیاری دنیا کا ایک ناقص نمونہ ہے۔ جنت آج کی ناقص دنیا کی ایک زیادہ کامل صورت ہے۔ جنت ایک

E:\Imran
nt-page\a
net

ابدی دنیا ہے جب کہ موجودہ دنیا صرف ایک فانی دنیا۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں وہ لوگ چنے جارہے ہیں جو اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کریں کہ وہ جنت کی اعلیٰ دنیا میں بسائے جانے کے اہل ہیں۔ سلکشن کی یہ مدت جب پوری ہوگی تو منتخب افراد جنت کی معیاری دنیا میں پہنچادئے جائیں گے، جہاں نہ کوئی تکلیف ہے اور نہ کوئی اندیشہ، جہاں نہ کوئی شور ہے اور نہ کوئی مصیبت۔ اور جو لوگ اس معیار پر پورے نہ اتریں انہیں کائنات کے ابدی کوڑے خانے میں پھینک دیا جائے گا۔ آج کی دنیا میں لوگوں کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر عورت اور ہر مرد بے اطمینانی کی حالت میں جی رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جن کو بظاہر دنیا کے سارے سامان حاصل ہیں، وہ بھی مطمئن نہیں۔ اس بے اطمینانی کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے معیاری دنیا (ideal world) کا طالب ہے جب کہ موجودہ دنیا اپنے سارے ساز وسامان کے باوجود ایک غیر معیاری دنیا ہے۔ انسان کی طلب اور موجودہ دنیا کے درمیان یہی فرق بے اطمینانی کا اصل سبب ہے۔

جنت میں یہ فرق ختم ہوجائے گا۔ وہاں کی جنت عین وہی معیاری دنیا ہوگی جس کی طلب انسان اپنے اندر فطری طور پر پاتا ہے۔ جنت میں ہر عورت اور ہر مرد کو پورا فل فلمنٹ (fulfilment) حاصل ہوگا۔ وہاں ہر ایک اپنی طلب کے مکمل جواب کو پالے گا۔

یہی وہ جنت کی معیاری دنیا ہے جس کے بارے میں پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا خیال گزرا (لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر)

انسان کو اس کی ابدی عمر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل مسئلہ دنیا کی کامیابی یا دنیا کی ناکامی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اگلی دنیا میں جہنم کی سزا سے بچے اور اپنے آپ کو جنت میں داخلہ کا مستحق بنائے۔ ایسی حالت میں انسان کو چاہیے کہ وہ جہنم سے سب سے زیادہ ڈرے، اور وہ جنت کا سب سے زیادہ خواہش مند بنے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور یہی حقیقت پسندی کا تقاضا بھی۔

قولِ زور، عملِ زور

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **من لم يدع قول الزور والعمل به، فليس لله حاجة في أن يدع طعامه وشرابه** (صحیح البخاری، کتاب الصوم، رقم الحدیث ۱۹۰۳) یعنی جس شخص نے روزہ رکھ کر جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

روزہ بظاہر اس کا نام ہے کہ آدمی صبح سے شام تک کھانا اور پینا چھوڑ دے۔ مگر یہ روزہ کی ظاہری صورت ہے، اور صرف ظاہری صورت کا نام روزہ نہیں۔ مطلوب روزہ وہ ہے جس میں ظاہری صورت کے ساتھ اس کی داخلی روح بھی پائی جائے۔ یہ داخلی روح یا صوم اسپرٹ ہی کسی کے روزہ کو حقیقی روزہ بناتی ہے۔ روزہ رکھ کر کوئی شخص قول زور اور عمل زور میں مبتلا ہو تو اس کا روزہ روزہ نہیں۔

قول زور یا جھوٹ بولنا یہ ہے کہ آدمی کھلے طور پر خلاف واقعہ بات کہے۔ مثلاً وہ اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ نہ کرے اور کہے کہ میں تو اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہوں۔ اس روش کو کذب یا براہ راست جھوٹ بولنا کہہ سکتے ہیں۔

عمل زور یا جھوٹ پر عمل کرنا یہ ہے کہ آدمی اپنے کام کی جھوٹی تاویل کرے۔ یعنی غلط کام کرنا اور اس کے لیے جھوٹا جواز پیش کرنا (Doing wrong under false justification.)۔

سیدھے طور پر جھوٹ بولنا بلاشبہہ برا ہے۔ مگر یہ بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے کہ آدمی ایک برا کام کرے اور اس کو ایک خوبصورت نام دے۔ مثلاً مادی مقصد کے تحت ایک کام کرنا اور اس کو خدمتِ دین بتانا۔ عوامی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ایک کام کرنا اور اس کو دعوت کا عنوان دینا۔ دولت حاصل کرنے کے لیے ایک کام کرنا اور اس کو ملّی یا سماجی کام بتانا۔ لیڈری حاصل کرنے کے لیے ایک کام کرنا اور اس کو اصلاح کا نام دینا، وغیرہ۔ جھوٹ بولنا اور خوبصورت الفاظ کے پردہ میں جھوٹا کام کرنا دونوں یکساں طور پر ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ٹیلی ویژن کا استعمال

نئی دہلی کے اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے شمارہ ۱۱ اگست ۲۰۰۴ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس رپورٹ میں ٹی وی کے بارے میں دو مختلف ''فتووں'' کا ذکر ہے۔ ایک فتوے میں کہا گیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیے ٹی وی کا استعمال جائز ہے۔ دوسرے فتوے میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ ٹی وی تفریح کا ذریعہ ہے جس پر فحش پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ دینی پروگرام کے لیے اس کا استعمال ناجائز ہے (صفحہ ۱)

اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنا ایک ایسا کام ہے جو اہل اسلام پر فرض ہے۔ اس کو ہر دور اور ہر حال میں انجام دینا ہے۔ یہ واضح بات ہے کہ یہ کام اسی جگہ کیا جائے گا جہاں لوگ موجود ہوں یا اسی ذریعہ سے کیا جائے گا جو لوگوں تک پہنچنے والا ہو۔ کسی الگ تھلگ جزیرہ میں انفرادی طور پر یہ کام نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں یہ شرط لگانا کہ صرف اسی مقام پر یا اسی ذریعہ سے یہ کام کیا جائے گا جہاں کوئی برائی نہ ہو تو اس طرح سرے سے یہ کام ہی انجام نہ پائے گا کیوں کہ دوسرے لوگ کبھی ہماری شرطوں پر ہم کو نہیں مل سکتے۔

مثال کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ۶۱۰ء میں پیغمبری ملی۔ اس وقت وہاں یہ حال تھا کہ کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ گویا کہ کعبہ کو عملاً بت خانہ بنا دیا گیا تھا۔ دوسری طرف یہ صورت حال تھی کہ اس وقت کے مکہ میں کعبہ ہی لوگوں کے لیے مقام اجتماع بنا ہوا تھا۔ مکہ کے لوگ روزانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ مکہ والوں تک دین توحید کا پیغام پہنچانے کے لیے جو قابل حصول مقام تھا وہ یہی کعبہ تھا۔ جہاں لوگ اپنے بتوں کی نسبت سے اکٹھا ہوتے تھے۔ کسی اور جگہ ان لوگوں کو پانا ممکن ہی نہ تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں ایک حکمت اختیار کی۔ آپ نے بت کے معاملہ کو اور دعوت کے معاملہ کو ایک دوسرے سے الگ کر کے لیا۔ آپ نے اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ

جولوگ وہاں اکھٹا ہوتے ہیں وہ بتوں کی نسبت سے اکھٹا ہوتے ہیں۔آپ نے اس پہلو کونظر انداز کر کے اُس وقت کعبہ کوصرف مقام اجتماع کے طور پر لیا اور وہاں جا کر وہاں کے موجود لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگے اور توحید کا پیغام دینے لگے۔اس حکمت نبوی کو ایک لفظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ـــ مسائل کونظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔

یہی حکمت ہمیں ٹی وی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیے۔یعنی دوسرے غیر مطلوب پروگرام جو ٹی وی میں آتے رہتے ہیں ان کونظر انداز کر کے اس میڈیم کے ذریعہ اپنا دینی پروگرام پیش کرنا۔کیوں کہ ٹی وی کے عمومی رواج کی بنا پر یہ صورت حال ہے کہ ہم کو زیادہ سامعین ٹی وی ہی کے ذریعہ مل سکتے ہیں، کسی اور ذریعہ سے ہمیں زیادہ سامعین نہیں ملیں گے۔

تاہم اس کا ایک اور پہلو ہے۔اس کا تعلق ان پروگراموں سے ہے جو آج کل اسلامی پروگرام کے نام پر ٹی وی میں دکھائے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام عملاً زیادہ مفید نہیں۔ ٹی وی کے دوسرے پروگراموں کی طرح ان اسلامی پروگراموں کو بھی تفریح کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہے۔ یہ پروگرام بھی اسلام کے نام پر تفریحی پروگرام ہوتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ زیادہ تر اسلامی تفریح ہوتے ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی پروگرام۔

جولوگ ٹی وی دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ دوسرے مذہب کے لوگ بھی اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ٹی وی کو استعمال کرتے ہیں۔میری معلومات کے مطابق، اس اعتبار سے سب سے اچھی مثال مسیحی پروگرام کی ہے۔اردو اور دوسری زبانوں میں روزانہ مسیحی پروگرام آتے رہتے ہیں۔یہ پروگرام فنی اعتبار سے ممتاز طور پر بہتر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہر مسلم ملک میں اسلامی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔مگر میری معلومات کے مطابق، لوگ اس کو بہت کم دیکھتے ہیں۔ غالباً اس کا سبب ان پروگراموں کا غیر معیاری ہونا ہے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار اس کا تجربہ ہوا ہے کہ کسی مسلم ملک میں میرا جانا ہوا۔ وہاں میں نے تحقیق کی کہ وہاں کے ٹی وی پر جو اسلامی پروگرام آتے ہیں اس کو لوگ کتنا زیادہ دیکھتے ہیں۔معلوم

ہوا کہ بہت کم لوگ ٹی وی کے اس اسلامی پروگرام کو دیکھتے ہیں۔ اکثر مقام پر یہ حال ہے کہ جب ٹی وی پر اسلامی پروگرام آتا ہے تو گھر والے یہ کہہ کر اس کو بند کر دیتے ہیں کہ — اس کو بند کرو، یہ تو سرکاری پروگرام ہے۔

برصغیر ہند کے تقریباً تمام مسلمان اقبال کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اقبال کا کلام ان لوگوں کے لیے صرف گنگنانے کا نغمہ ثابت ہوا ہے، نہ کہ زندگی کے لیے عملی رہنمائی لینے کا ذریعہ۔ مثلاً اقبال نے کہا تھا:

آئینِ نَو سے ڈرنا طرزِ کہن پر اَڑنا منزل بہت کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مگر مسلمانوں، خاص طور پر مذہبی طبقہ کا یہ حال ہے کہ وہ ہر نئی چیز پر بھڑکتے ہیں۔ وہ ہر نئی چیز پر منفی ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اسی کی ایک مثال ٹی وی ہے۔ مذہبی طبقہ کے درمیان ٹی وی کو اتنا ہی برا سمجھا جاتا ہے جتنا کہ شیطان کو۔

اس معاملہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ ٹی وی اور ٹی وی کے غلط استعمال کے درمیان فرق کیا جائے۔ ٹی وی تو ایک خدائی قدرت کا ظہور ہے۔ وہ خدا کے بنائے ہوئے فطری قانون کا استعمال ہے۔ ٹی وی کا طریقہ امکانی طور پر خود خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں چھپا ہوا تھا۔ انسان کا حصہ اُس میں صرف اتنا ہے کہ اُس نے اُس کو دریافت کر کے اُسے استعمال کیا۔ ٹی وی کی ٹیکنالوجی اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی دین ہے نہ کہ کسی دشمن اسلام کی دین۔

یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ ٹی وی پر بہت سے غیر اخلاقی پروگرام آتے ہیں۔ مگر یہ ٹی وی کا غلط استعمال ہے۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ غلط استعمال ہر چیز کا ہو سکتا ہے، حتیٰ کہ ثابت شدہ طور پر مقدس چیزوں کا بھی۔ غلط استعمال کی بنا پر کسی چیز کو چھوڑ نہیں دیا جائے گا بلکہ اُس کے استعمال کو درست کیا جائے گا۔

اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ذمہ داری صرف یہ نہیں ہے کہ وہ منفی ردعمل ظاہر کر کے الگ ہو جائے۔ اس معاملہ میں مذہبی طبقہ کی ایک مثبت ذمہ داری ہے۔ اور یہ کہ ان لوگوں کو چاہیے کہ وہ ٹی وی

کے طریقہ کو فنّی طور پر سمجھیں۔ وہ اس کے استعمال کی تفصیلات کو جانیں۔ وہ یہ دریافت کریں کہ ٹی وی کو کس طرح اصلاحی کام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پھر مذہبی طبقہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ضروری تیاری کے بعد ٹی وی کے لیے اعلیٰ درجہ کے اسلامی پروگرام تیار کرے، ایسا پروگرام جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ جس کو دیکھنے کے لیے لوگ راغب ہوں۔ جو آج کے انسان کے ذہن کو ایڈرس کرے۔

اسلام کا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہے بلکہ منفی حالات میں مثبت پہلو تلاش کرنے کا طریقہ ہے۔ اس کی ایک مثال قدیم کعبہ کی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر عورت اور مرد کو آزادی دی گئی ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ موجودہ دنیا میں سب کچھ ٹھیک رہے، کوئی ناخوشگوار بات پیش نہ آئے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ناموافق حالات موجود رہیں گے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ناموافق حالات کے درمیان موافق پہلو کو دریافت کریں اور اس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

اس اصول کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ان مع العسر یسرا ۔یعنی جہاں مسائل ہیں، وہیں مواقع بھی موجود ہیں۔ تم مسائل کو نظر انداز کرو اور مواقع کو استعمال کرو۔ یہ ایک آفاقی حکمت ہے۔ اس حکمت کا تعلق ٹی وی سے بھی ہے اور دوسری تمام چیزوں سے بھی۔

اصلاح کے نام پر فساد

ایک گاؤں میں ایک قدیم مکتب تھا۔ یہ مکتب معمولی حالت میں تھا۔ اس کے بعد ایک نوجوان عالم کو اس کا ناظم بنایا گیا۔ انہوں نے رات دن محنت کی۔ لوگوں سے تعاون حاصل کیا۔ لوگوں کی رایوں اور لوگوں کے تجربوں سے فائدہ اُٹھایا۔ یہاں تک کہ چند سال کی کوششوں سے یہ مکتب ایک بڑا مدرسہ بن گیا۔ اس کی کئی بلڈنگیں کھڑی ہوگئیں۔ اسی کے ساتھ اُنہوں نے یہ اضافہ کیا کہ الگ سے لڑکیوں کا ایک مدرسہ نئی عمارت میں قائم کیا۔

مذکورہ نوجوان عالم کے حوصلے بلند تھے۔ اب انہوں نے ایک نیا منصوبہ بنایا کہ مدرسہ کے ساتھ الگ بلڈنگ میں ایک اسکول بھی قائم کریں۔ گاؤں کے لوگوں پر فرض تھا کہ وہ تعلیم کی اس ترقی پر خوش ہوں۔ وہ نوجوان عالم کو دعائیں دیں۔ حسب مقدور اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اور اگر اس قسم کا کوئی مثبت عمل پیش نہ کرسکیں تو حدیث کے مطابق، کم از کم یہ کریں کہ اگر وہ ادارہ کو نفع نہ پہنچا سکیں تو اُس کو نقصان بھی نہ پہنچائیں (ان لم تنفعه فلا تضره)۔

مگر بدقسمتی سے وہی ہوا جو اکثر دوسرے مقامات پر موجودہ زمانہ میں پیش آرہا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ اصلاح کے نام پر فساد کے درپے ہوگئے۔ حتّٰی کہ اُن کی منفی سرگرمیوں کے نتیجہ میں مدرسہ کو عملاً بند کردینا پڑا۔

ان تخریب پسند مصلحین کا کہنا یہ تھا کہ مذکورہ نوجوان عالم اپنی ذاتی رائے سے مدرسہ کو چلا رہے ہیں۔ حالاں کہ قرآن کا حکم ہے کہ مسلمانوں کا اجتماعی کام شورائی انداز میں چلایا جائے۔ مجھے اس میں شک نہیں کہ یہ حضرات خلیفۂ چہارم حضرت علی کے اس قول کا مصداق ہیں کہ: کلمة حق اريد بها الباطل۔ یعنی انہوں نے بظاہر ایک قرآنی آیت کا حوالہ دیا مگر اس سے ان کا مقصد فساد کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ جلن اور حسد کا معاملہ ہے، نہ کہ قرآن کے اتباع کا معاملہ۔

یہ حضرات قرآن کی آیت: امرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ ۳۸) کا حوالہ دیتے ہیں۔ یعنی اُن کا معاملہ آپس میں مشورہ ہے۔ اس آیت میں مشورہ کی تعلیم بطور لازمی حکم نہیں ہے بلکہ اس میں ایک اسپرٹ کا ذکر ہے۔ یعنی یہ روحِ شوریٰ ہے، نہ کہ حکم شوریٰ۔ ایمان آدمی کے اندر سنجیدگی اور احتیاط پیدا کرتا ہے۔ اس بنا پر وہ ایسا کرتا ہے کہ معاملات میں وہ ہمیشہ دوسروں سے مشورہ لیتا ہے۔ وہ دوسروں کی رائیں معلوم کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ تنقید کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ سنتا ہے۔ ایسا وہ اس لیے کرتا ہے تاکہ وہ پیش آمدہ معاملہ میں درست فیصلہ لے سکے۔ اس شورائی اسپرٹ کا تعلق انفرادی معاملہ سے بھی ہے اور اجتماعی معاملہ سے بھی۔

دو باتیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ایک ہے، معاملات میں مشورہ لینا، اور دوسرا ہے، لوگوں کے مشورہ کے مطابق عمل کرنا۔ مذکورہ آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ پہلی بات ہے نہ کہ دوسری بات۔ اس آیت میں اس کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ معاملات میں دوسروں کے ساتھ مشورہ کریں، وہ کھلا ڈسکشن کریں، وہ فکری تبادلۂ خیال (intellectual exchange) کریں۔ وہ لوگوں کی رائیں سنیں اور اپنی رائے دوسروں کو بتائیں۔ مذکورہ قرآنی آیت کا مدّعا اصل میں یہی ہے، نہ کہ شوریٰ کے نام پر ایک باقاعدہ تنظیم بنانا۔

مذکورہ مدرسہ کے معاملہ میں اگر اس قرآنی آیت کو منطبق کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مدرسہ کے ناظم کو چاہیے کہ مدرسہ کا کام چلاتے ہوئے وہ لوگوں سے مشورہ لیتے رہیں۔ لوگوں کی رائیں اور تجربے سے استفادہ کرتے رہیں۔ کوئی فیصلہ لینے سے پہلے لوگوں سے ڈسکشن کریں تاکہ وہ زیادہ صحیح فیصلہ لے سکیں۔ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ گاؤں کے لوگ مدرسہ کے ناظم کے اوپر انسپکٹر بن جائیں۔ وہ قرآن کی آیت کے حوالہ سے ناظم کا محاسبہ کریں۔ وہ اس کو مدرسہ سے اکھاڑنے کی تدبیریں کریں۔ اس قسم کی روش بلاشبہہ تخریب ہے۔ وہ نہ مشورہ ہے اور نہ تعمیر۔

شوریٰ یا مشورہ کا یہ مفہوم قرآن کی دوسری آیت سے واضح ہو رہا ہے۔ قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے یہ ارشاد ہوا ہے: وشاورھم فی الامر فاذا عزمت

فتوکل علی اللہ (آل عمران ۱۵۹) یعنی تم ان سے معاملہ میں مشورہ لو، پھر جب تم عزم کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو۔

قرآن کی یہ آیت بظاہر پیغمبر اسلام کو خطاب کرتی ہے۔ مگر پیغمبر اسلام ایک اعتبار سے پیغمبر تھے اور دوسرے اعتبار سے وہ تمام اہل ایمان کے لیے اسوہ تھے۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اصل چیز مشورہ کی اسپرٹ ہے نہ کہ مشورہ کا نظامی ڈھانچہ۔ اس کے مطابق، ہر مومن کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ چھوٹے اور بڑے ہر معاملہ میں بار بار لوگوں سے پیش آمدہ معاملہ میں مشورہ لے۔ وہ لوگوں سے ڈسکشن کرے۔ وہ معاملہ کے سارے پہلوؤں پر نہ صرف خود غور کرے بلکہ اس کو دوسروں کے ساتھ زیر بحث لائے۔ اس طرح وہ زیادہ بہتر طور پر اس پوزیشن میں ہوگا کہ وہ یقین کے ساتھ فیصلہ لے سکے۔ اور جب وہ اس طرح کسی فیصلہ پر پہنچ جائے تو خدا کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کردے۔

قرآن کی اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شوریٰ یا مشورہ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ معروف جمہوری ڈھانچہ کی صورت میں اس کا ایک قانونی نظام بنایا جائے اور اس نظام کے ممبران کے اتفاق رائے یا ان کی کثرت رائے کو حتمی حیثیت دے کر اس کے مطابق کام کیا جائے۔ اسلام کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس قسم کا نظامی ڈھانچہ نہ پیغمبر اسلام کے زمانہ میں بنایا گیا اور نہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں اور نہ بعد کے زمانہ میں موجود تھا۔ جو چیز موجود تھی وہ یہ کہ صاحب امر معاملات میں ہمیشہ لوگوں کی رائے دریافت کرتا جس کا مقصد خود اپنے آپ کو تیار کرنا ہوتا تھا۔ اور جب صاحب امر یہ سمجھ لیتا کہ اس کی ذہنی تیاری کا کام ہو چکا ہے تو وہ اللہ کے بھروسہ پر اقدام کرتا۔ گویا کہ اسلام میں شورائی کلچر ہے، اسلام میں شورائی نظام نہیں۔ واضح ہو کہ اسپرٹ کے ساتھ ہی شوریٰ کا فائدہ ہے۔ اگر اسپرٹ نہیں تو شوریٰ بھی نہیں۔ کوئی تنظیمی ڈھانچہ اسپرٹ کا بدل نہیں بن سکتا۔

غیر رسمی شورائیت تو اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ مگر رسمی ڈھانچہ کے اعتبار سے شورائی نظام اسلام کی تاریخ میں پایا نہیں جاتا۔ گویا شورائی مزاج تو تھا مگر شورائی تنظیم جیسی کوئی چیز کبھی قائم نہیں کی گئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں پنج وقتہ نماز کا باقاعدہ نظام بنایا اور اس کے مرکز کے طور پر مسجد کی تعمیر کی۔ اسی طرح آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ شوریٰ کا تنظیمی ڈھانچہ بنائیں اور دارالشوریٰ کے نام سے اس کے لیے ایک عمارت تعمیر کریں جو بعد کے لوگوں کے لیے اس معاملہ میں ایک نمونہ ہو۔ اس قسم کا عمل نہ پیغمبر اسلام کے زمانہ میں کیا گیا، نہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں اور نہ بعد کے کسی زمانہ میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں شوریٰ بطور روح تو ضرور ہے مگر اسلام میں شوریٰ بطور ڈھانچہ نہیں۔

اس موضوع پر ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ شوریٰ کی نظامی تعبیر یا اس کی تنظیمی ڈھانچہ بندی کے قائل تھے۔ میں نے کہا کہ یہ مفہوم قرآن کے الفاظ سے نہیں نکلتا۔ اور اگر بالفرض اس کا یہ مفہوم ہو تو اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی اس پر عمل نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ پیغمبر اسلام ایک مکمل اسوہ بنا کر بھیجے گئے۔ مگر آپ نے کبھی تنظیمی مفہوم میں شوریٰ کا کوئی نظام نہیں بنایا۔ خلفاء راشدین کے زمانہ میں ایسا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا۔ بعد کے زمانہ میں بھی کسی دور میں شوریٰ کے نام سے کسی تنظیمی ڈھانچہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ حتّٰی کہ پانچویں خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں بھی نہیں۔ ہر دور میں مشورہ ضرور تھا، مگر کسی بھی دور میں اس مقصد کے لیے کسی رسمی تنظیم کا ثبوت نہیں ملتا۔

انہوں نے کہا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بڑے بڑے صحابہ موجود تھے۔ اس لیے اس زمانہ میں مستقل شورائی تنظیم بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں اصل فیصلہ کن مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اکابر صحابہ موجود تھے یا نہیں۔ اصل قابل لحاظ مسئلہ یہ ہے کہ اشو پیدا ہوئے یا نہیں پیدا ہوئے۔ دور اول کی تاریخ بتاتی ہے کہ رسول کی وفات کے فوراً بعد بڑے بڑے اِشوز پیدا ہوئے — ارتداد کا مسئلہ، خلیفہ کے تقرر میں اختلاف، خلیفۂ سوم کے زمانہ میں مناصب کی تقرری میں اختلاف، خلیفۂ چہارم کے زمانہ میں خون عثمان کے معاملہ میں اختلاف، حسن اور حسین کے زمانہ میں خروج کے مسئلہ پر اختلاف، وغیرہ۔ مگر اس پوری مدت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس پر غور و فیصلہ کے

لیے تنظیمی مفہوم میں کوئی باقاعدہ شوریٰ بنائی جائے۔

ایسی حالت میں یہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ قرآن میں ایک ایسے اجتماعی اصول کا حکم دے دیا جائے جس پر کبھی عمل ہی نہ کیا جائے۔ جس کے لیے یہی مقدر ہو کہ وہ ہمیشہ کے لیے کتابوں میں معطل پڑا رہے۔

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو لوگوں سے اتنا زیادہ مشورہ کرتا ہو جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے (**ما رأیت رجلاً اکثر استشارۃ للرجال من رسول اللہ صلعم**) پیغمبر اسلام کے زمانہ میں تمام اکابر صحابہ موجود تھے۔ پھر اگر اکابر صحابہ کی موجودگی شوریٰ میں مانع ہو تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی میں اتنا زیادہ مشورہ کیوں کرتے تھے۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اکابر صحابہ کی موجودگی یا غیر موجودگی کا کوئی تعلق شوریٰ کے عمل سے نہیں ہے۔ شوریٰ یا مشورہ انسانی زندگی کا ایک جزو ہے۔ اُس کو کسی بھی حال میں زندگی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

تنظیم ایک محدود گروہ کا نام ہوتا ہے۔ شوریٰ کو تنظیمی ڈھانچہ کی صورت دینا شوریٰ کی افادیت کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ شوریٰ کے مقرر ممبران ہی ساری بات جانتے ہوں۔ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کے بارے میں ممبران شوریٰ کے باہر کے افراد زیادہ بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ بدر کے میدان کے انتخاب کے بارے میں ایک عام آدمی کا قیمتی مشورہ۔ اسی طرح غزوۂ خندق کے موقع پر ایک ایرانی نومسلم کا نہایت مفید مشورہ وغیرہ۔ ایسی حالت میں شورائی تنظیم کے مقابلہ میں شورائی کلچر کا اصول زیادہ بامعنٰی اور زیادہ کارآمد ہے۔

ضرورت کے تقاضے کے تحت شوریٰ کا تنظیمی ڈھانچہ بنایا جا سکتا ہے۔ مگر اس قسم کے تنظیمی ڈھانچہ کو شرعی معنوں میں فرض کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ شرعی فرض وہی ہوگا جو قرآن وسنت سے براہ راست طور پر ثابت ہو اور جس کی نظیر **قرون مشہود لھا بالخیر** میں پائی جائے۔

دیباچہ

زیرِ نظر کتاب اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب: حریف یا حلیف اپنے موضوع پر ایک دلچسپ اور قابل مطالعہ کتاب ہے۔ یہ کتاب ۲۲ ممتاز مسلم شخصیتوں کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ اس بنا پر اس کتاب میں تنوع کی صفت پیدا ہوگئی ہے۔ اس میں زیر بحث موضوع پر مختلف تعلیم یافتہ شخصیتوں کے اپنے اپنے افکار اور تجربات کا خلاصہ دیکھا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کو پاکستان کے ایک معروف صحافی مسٹر افضال ریحان نے مرتب کیا ہے۔ کتاب میں جو مختلف انٹرویوز شامل ہیں وہ سب انہی کے لیے ہوئے ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ انٹرویو لینا ایک مشکل آرٹ ہے۔ انٹرویور جب سوال کرتا ہے تو اپنے ہر سوال میں وہ خود اپنے آپ کو متعارف کراتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کتاب میں مسٹر افضال ریحان کے سوالات ان کی اپنی شخصیت کا تعارف ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو یہ سوالات خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سوالات کے ذریعہ انٹرویور کی جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے وہ ایک ایسے انسان کی شخصیت ہے جو ذہین اور سنجیدہ ہونے کے ساتھ مثبت طرز فکر کا حامل ہے۔

کتاب میں جو انٹرویوز شامل کیے گیے ہیں ان میں غور وفکر کا کافی مواد موجود ہے۔ بار بار ایسی باتیں سامنے آتی ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اس قسم کے چند جملے یہاں مثال کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

کسی بھی قوم کے رہن سہن (way of living) کا نام کلچر ہے۔ دنیا کی ہر قوم کا ایک کلچر ہوتا ہے جب کہ سولائزیشن سے مراد شہری زندگی ہے۔ کلچر کے ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک پہنچنے کا نام سولائزیشن ہے۔ افریقہ جیسے پسماندہ خطے میں بھی کلچر تو ہے لیکن وہ سولائزڈ (مہذب) نہیں ہے (160)۔ غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا تعلق داعی اور مدعو جیسا ہونا چاہیے نہ کہ دشمن جیسا (2)۔ اپنی اصلاح کی بجائے ماضی پر فخر کرنا ہمارا شیوہ بن چکا ہے (37) ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ ”مسلمان اور غیر مسلموں

کے تعلقات امن پر مبنی ہیں لڑائی پر نہیں‘‘ (38)۔ اسرائیل میں بوسنیا کے مسلمانوں کا وفد آیا تو انہیں وہاں پناہ دی گئی اور کہا گیا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں اور آپ کو دیکھ کر ہمیں اپنی دربدری کا زمانہ یاد آ گیا ہے (40)۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلامی تہذیب نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے بلکہ یہ سب مسلم تہذیبیں ہیں اور اس پر آفاقی رنگ کے بجائے علاقائی رنگ غالب رہا ہے (101)۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں سب سے پہلے اسلام کے essential اور non-essential میں فرق کرنا پڑے گا(104)۔ عجیب بات ہے کہ مسلمان امریکا میں رہنا پسند بھی کرتے ہیں اور اس کو گالی بھی دیتے ہیں(107)۔ اسلامی تہذیب دنیا میں داعی اور مدعو کا پیغمبرانہ رشتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان قائم کرنا چاہتی ہے(109)۔

برٹرینڈ رسل کا قول ہے کہ جب میں نے اسلام کی تعلیمات پڑھیں تو میری خواہش ہوئی کہ میں مسلمان ہو جاؤں لیکن جب میں نے مسلمانوں کو دیکھا تو یہ سوچا کہ میں جیسے ہوں ویسے ہی بہتر ہوں(120)۔ خودکش حملہ دہشت گردی کی ایک تکلیف دہ شکل ہے(162)، وغیرہ۔

جہاں تک کتاب کے اصل موضوع کا تعلق ہے، وہ بلاشبہہ ایک اہم موضوع ہے۔ یہ موضوع اگرچہ پچھلی تقریباً پانچ سو سالہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے مگر مختلف پہلوؤں سے اس کی اہمیت بدستور زندہ ہے اور ضرورت ہے کہ اس کا مزید جائزہ لیا جائے۔

عام تصور کے مطابق، اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ حتیٰ کہ سموئیل ہنٹنگٹن کی مشہور کتاب کے مطابق، دونوں تہذیبیں ایک دوسرے کے خلاف متصادم ہیں۔ یہ تصادم تشدد کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ مگر راقم الحروف کے نزدیک یہ تجزیہ اصل واقعہ کے مطابق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی تہذیب اصولی طور پر اسلام کے حق میں ایک معاون واقعہ تھا۔ اُس نے اسلام کے لیے بہت سے نئے امکانات کھولے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک مطلوب انقلاب تھا۔ اس انقلاب کے لانے والوں میں بالفرض اگر کچھ منفی پہلو پائے جاتے ہوں تب بھی اس انقلاب کا

مؤید اسلام ہونا مشتبہ نہ ہوگا۔ احادیث سے ثابت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار غیر مسلموں کی رائے یا ان کے طریقہ کو کسی عملی معاملہ میں اختیار فرمایا۔

فنی تعریف سے قطع نظر، کوئی تہذیب ہمیشہ تخلیقی طاقت کے زور پر اُٹھتی ہے۔ کوئی گروہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے ذریعہ نئی فکری اور عملی طاقتوں کو دریافت کرتا ہے۔ یہ دریافت اُس گروہ کو دوسرے لوگوں سے آگے کر دیتی ہے۔ اس طرح ایک تہذیب وجود میں آتی ہے اور اس تہذیب کے حامل دوسروں کے اوپر فوقیت حاصل کر لیتے ہیں۔

مغربی تہذیب کا ظہور اصلاً اسی قسم کے ایک مثبت واقعہ کی حیثیت سے ہوا۔ مگر بعد کو اس میں ایسے اضافی پہلو شامل ہو گئے جن کی وجہ سے مغربی تہذیب کی وہ متنازعہ صورت بن گئی جو آج نظر آتی ہے۔ یہ اضافی پہلو خاص طور پر دو ہیں۔ ایک پہلو کا تعلق خود مغربی تہذیب کے علم برداروں سے ہے۔ اور دوسرے پہلو کا تعلق اُن مسلم علماء اور دانشوروں سے ہے جنھوں نے اس کو غیر اسلامی قرار دے کر مطلق طور پر اس کی مخالفت شروع کر دی۔

مغربی تہذیب کا آغاز زیادہ واضح صورت میں سولہویں صدی میں ہوا۔ اُس وقت یہ تہذیب فطرت کے قوانین یا فطرت میں چھپی ہوئی طاقتوں کی دریافت کے ہم معنٰی تھی۔ مگر یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ اپنے ابتدائی زمانہ میں مغربی تہذیب کے بانی سائنسدانوں نے عالمی فطرت کے جو حقائق دریافت کیے وہ زوال یافتہ مسیحیت کے مزعومہ عقائد سے ٹکراتے تھے۔ مسیحیت کے پیشوا چوں کہ اس وقت اقتدار کی حالت میں تھے، اُنھوں نے ان سائنس دانوں کی سخت مخالفت کی اور انہیں سخت سزائیں دیں۔ ان سزاؤں کی تفصیل ڈریپر کی مشہور کتاب (Conflict between Science and Religion) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ ٹکراؤ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اہل سائنس اور اہل مذہب کے درمیان تھا۔ مگر غلط طور پر اس کو سائنس اور مذہب کا ٹکراؤ سمجھ لیا گیا۔ اُس وقت جذباتی ہیجان کی بنا پر اس فرق کو سمجھا نہ جا سکا اور مغربی تہذیب غلط طور پر اپنے آغاز ہی میں عملاً ایک مخالفِ مذہب تہذیب کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس

کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کے لوگ مذہب کو اپنا حریف سمجھنے لگے اور اہل مذہب نے مغربی تہذیب کو اپنا دشمن فرض کرلیا۔ یہ منفی ذہن ابتداء مسیحیت کے مقابلہ میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ توسیع پاکر دوسرے مذاہب تک پہنچ گیا۔

موجودہ زمانہ میں تقریباً تمام مسلم علماء اور دانشوروں کا رخ مغربی تہذیب کے معاملہ میں منفی رہا۔ اس کا سبب بھی حقیقی کے بجائے اضافی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں جب یہ مغربی تہذیب اپنے عروج تک پہنچ کر مسلم دنیا میں داخل ہوئی تو یہ داخلہ صرف ایک تہذیبی داخلہ نہ تھا بلکہ وہ سیاست اور ملک گیری کے جلو میں ہوا جس کو نوآبادیاتی نظام (colonialism) کہا جاتا ہے۔

مغربی تہذیب کے اس سیاسی مارچ کی زد سب سے زیادہ جن لوگوں پر پڑی وہ مسلمان تھے۔ اس وقت ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبہ میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں۔ مغربی تہذیب کے سیاسی مارچ نے ان مسلم حکومتوں کا خاتمہ کرکے ان کے اوپر اپنا غلبہ قائم کردیا۔

انیسویں صدی کے مسلم علماء اور دانشور مغربی تہذیب اور اس کے سیاسی پہلو میں فرق نہ کرسکے۔ مغربی سیاست کو ایک غیر مطلوب چیز سمجھنے کے ساتھ انہوں نے یہ کیا کہ خود مغربی تہذیب کو بھی ایک غیر مطلوب چیز سمجھ لیا۔ انگریز سے متنفر ہونے کے ساتھ وہ انگریزی سے بھی متنفر ہوگئے۔ ابتدائی طور پر دو چیزوں کے درمیان یہی عدم تمیز تھی جس نے مغربی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں نفرت پیدا کردی۔ مگر بعد کو خود مغربی تہذیب میں کچھ مزید برائیاں پیدا ہوئیں۔ یہ برائیاں اگرچہ اضافی تھیں مگر وہ اسلامی مزاج کے سراسر خلاف تھیں۔ اس لیے مغربی تہذیب کے معاملہ میں مسلم علماء اور دانشوروں کے منفی ذہن میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔

اس معاملہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے مسیحی مذہب کے خلاف ردعمل میں آزادی کے تصور کو اتنا زیادہ بڑھایا کہ اس کو خیر مطلق (summum bonum) کا درجہ دے دیا۔ انسانی آزادی کے نام پر مذہبی قدروں کی وسیع پیمانہ پر پامالی شروع ہوگئی۔ اس کی آخری حد وہ مجرمانہ عریانیت (criminal pornography) ہے جو اب شرمناک حد تک غیر انسانی صورت اختیار کرچکی ہے۔ تاہم

ان تمام منفی پہلوؤں کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ مغربی تہذیب نے اسلام اور اسلامی دعوت کے حق میں ایسے نئے امکانات کا دروازہ کھولا ہے جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ مسلمان اگر خذ ما صفا، د ع ما کدر کے اصول کے مطابق یہ کریں کہ وہ مغرب کے برے پہلوؤں کو نظر انداز کریں اور اس کے موافق پہلوؤں کو لے لیں تو بلاشبہہ مغربی تہذیب ان کے لیے ایک عظیم نعمت ثابت ہوسکتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ وسیع تر معنوں میں اسلام کے دو پہلو ہیں — اساسات اسلام، اور تائیدات اسلام۔ اساسات اسلام سے مراد اسلام کی وہ بنیادی تعلیمات ہیں جن کا ماخذ وحی الٰہی ہے، یعنی عقائد، عبادات، اخلاقیات، اور روحانیات وغیرہ۔ اسلام کا یہ پہلو پیغمبر اسلام کے زمانہ میں آخری طور پر مکمل ہو چکا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے قرآن اور حدیث اور سیرت کا مطالعہ بالکل کافی ہے۔ اس حصۂ اسلام میں اگر کوئی مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے تو وہ اصحابِ رسول کی سنت کا اضافہ ہے۔ اس کے بعد اس حصۂ اسلام میں کوئی اور اضافہ بدعت ہے، اور اسلام میں بدعت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

اسلام کا دوسرا حصہ جس کو ہم نے تائیدات اسلام کا نام دیا ہے اس کی نوعیت بالکل الگ ہے۔ یہ حصہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ اس میں غیر مومنین اور غیر مخلصین بھی مفید حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو ایک حدیث رسول میں ان الفاظ میں آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالرجل الفاجر (صحیح البخاری) یعنی اللہ اس دین کی تائید فاجر انسان کے ذریعہ بھی کرے گا۔

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو عظیم انقلاب برپا ہوا اس کے کچھ اجزاء ایسے تھے جو مستقبل میں تکمیل پانے والے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انقلاب محمدی نے انسانی تاریخ میں ایک عمل (process) جاری کیا۔ یہ عمل مختلف نشیب وفراز کے ساتھ مستقل جاری رہا۔ مغربی تہذیب اپنے سائنسی پہلو کے اعتبار سے اسی انقلابی عمل کا گویا ایک نقطۂ عروج (culmination) ہے۔

اس اعتبار سے اسلام کے حق میں جو مفید اسباب پیدا ہوئے ان کو چار عنوانات کے تحت بیان

کیا جاسکتا ہے۔ یہ چار عنوانات یہ ہیں— حفاظت اسلام، دلائل اسلام، دعوت اسلام، شعور اسلام۔

حفاظت اسلام

قرآن آخری آسمانی کتاب ہے۔ اس کے بعد اب خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آنے والی نہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کتاب کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔ اس منصوبۂ الٰہی کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ **انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحٰفظون** (الحجر ۹) یعنی ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

خدا کے قانون کے مطابق، اس حفاظت کا نظام اسباب کے دائرہ میں کرنا تھا۔ چنانچہ ظہور اسلام کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک اس کی حفاظت اس طرح کی جاتی رہی کہ قرآن کا ایک ایک نسخہ لوگ اپنے ہاتھ سے لکھتے رہے اور اسی کے ساتھ حافظہ کی مدد سے اس کو یاد کرتے رہے۔ اس طرح کتابت اور حفظ کے ذریعہ اس کو محفوظ حالت میں رکھا جاتا رہا۔ مگر موجودہ زمانہ میں پریس اور پرنٹنگ کے طریقہ نے قرآن کو زیادہ مستحکم طور پر محفوظ کر دیا ہے۔ یہ جدید ذرائع تمام تر مغربی تہذیب کے زیر اثر ظہور میں آئے ہیں۔

اسی طرح ظہور اسلام کے بعد ہزار سالہ ابتدائی تاریخ میں کثیر تعداد میں اسلامی موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ حدیث، سیرت، تاریخ، فقہ، اور دوسرے اسلامی علوم پر عربی زبان میں بہت بڑی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں اسلام کے کلاسیکل لٹریچر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر یہ تمام کتابیں مخطوطات کی شکل میں تھیں۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے مختلف اسلامی کتب خانوں کی الماریوں میں محفوظ تھے۔ قدیم زمانہ میں یہ کتابیں صرف مخصوص علماء کی دسترس تک محدود تھیں۔ آج وہ ساری دنیا میں ہر شخص کے لیے قابل حصول ہوگئی ہیں۔ ان کتابوں کی یہ عمومی اشاعت کیسے ممکن ہوئی۔ یہ واقعہ پرنٹنگ پریس کے ذریعہ ہوا۔ مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے پرنٹنگ پریس تیار کیا۔ انہوں نے اعلیٰ قسم کے کاغذ بنائے اور دوسری متعلق چیزیں ایجاد کیں۔ اس طرح یہ قیمتی کتابیں چھپ کر اور مجلّد ہو کر ساری دنیا میں پھیل گئیں۔

اسی طرح مغربی تہذیب کے زیر اثر ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ تمام قدیم کتابوں اور دستاویزات کی سائنٹفک تحقیق شروع ہوگئی۔ یہ ذوق توسیع پاکر مذاہب کی مقدس کتابوں تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ اس کے لیے ایک مستقل فن وجود میں آیا جس کو تنقید عالیہ (higher criticism) کہا جاتا ہے۔

اس کے تحت قدیم مذہبی کتابوں کی تحقیق وتنقید خالص علمی انداز میں کی جانے لگی۔ اس کے ذریعہ پہلی بار یہ حقیقت واضح ہوکر لوگوں کے سامنے آئی کہ اسلام کے سوا تمام دوسرے مذاہب کی مقدس کتابیں تاریخی اعتبار سے غیر معتبر ہیں۔ صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کی مقدس کتاب کو تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے۔ یہ اہم واقعہ بھی مغربی تہذیب کے زیر اثر پیش آیا۔

دلائل اسلام

قرآن میں آئندہ آنے والے عہد کے بارہ میں کچھ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک پیشین گوئی وہ ہے جو قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں بیان ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنی آیت کا ترجمہ یہ ہے: عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے نفسوں میں بھی، یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ حق ہے (حٰم السجدہ ۵۴)

قرآن کی اس پیشین گوئی کے مطابق، مستقبل میں ایسا ہونے والا تھا کہ کائنات میں چھپی ہوئی نشانیاں ظاہر ہوں اور وہ قرآن کے بیانات کی علمی تصدیق کریں۔ یہ واقعہ کب پیش آیا۔ وہ مسلم عہد میں پیش نہ آسکا۔ وہ مغربی تہذیب کے ظہور کے بعد موجودہ زمانہ میں پیش آیا۔ اس زمانہ میں مغربی سائنس دانوں نے کائنات کی تحقیق وتفتیش جدید ذرائع سے کی۔ اُنہوں نے دوربین اور خوردبین جیسے بہت سے طریقے ایجاد کیے جن کے ذریعہ کائنات میں چھپی ہوئی حقیقتیں ظاہر ہوکر انسانی علم کے دائرہ میں آگئیں۔

اس موضوع پر ایک مغربی سائنس داں کی انگریزی کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا ہے اور موضوع کی مناسبت سے اس کتاب کا نام بامعنٰی طور پر یہ رکھا گیا ہے: **الله يتجلى في عصر العلم** ۔ اس موضوع پر انگریزی زبان میں کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

The Evidence of God in an Expanding Universe
Nature and Science speak about God

راقم الحروف نے اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور اس کے بارہ میں کئی کتابیں تیار کر کے شائع کی ہیں۔ اُن میں سے ایک کتاب کا نام مذہب اور جدید چیلنج ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں **الاسلام یتحدی** کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کتاب کے ترجمہ کا نام گاڈ ارائزز (God Arises) ہے۔

مذہب اور جدید چیلنج (صفحات ۲۲۰) کا موضوع خاص طور پر یہی ہے۔ وہ گویا قرآن کی مذکورہ آیت کی سائنسی تفسیر ہے۔ اس کتاب میں دورِ جدید کی سائنسی دریافتوں کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ یہ دریافتیں قرآن کی تعلیمات کی سائنسی تصدیق ہیں۔ گویا کہ جو بات پہلے وحی کے ذریعہ بتائی گئی تھی وہ اب خود علمِ انسانی کی سطح پر ثابت شدہ بن گئی۔

قرآن میں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ آخری مرحلہ میں جب فرعون پانی میں غرق ہوا تو قرآن کے بیان کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: **فالیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك آیة** (یونس ۹۲) یعنی آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی بنے۔

جیسا کہ معلوم ہے، فرعون پانی میں ڈوب کر مرا۔ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ تھا کہ فرعون کا جسم اس کی موت کے بعد بھی محفوظ رہے اور بعد کے زمانہ میں ظاہر ہو کر وہ لوگوں کے لیے خدائی نشانی بنے۔ یہ واقعہ مسلم دور میں پیش نہ آسکا۔ ہزار سالہ مسلم دور میں وہ ایک نامعلوم واقعہ بنا رہا۔ انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار اہل مغرب نے اس کو اہرام مصر کے اندر دریافت کیا اور جدید سائنسی طریقوں کو استعمال کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ اسی فرعون کا جسم ہے جو حضرت موسیٰ کا ہم عصر تھا۔ (اس معاملہ کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب عظمت قرآن میں دیکھی جاسکتی ہے) نیز ملاحظہ ہو ڈاکٹر موریس بوکائی کی کتاب: The Bible, the Qur'an and Science

اہلِ اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خدا کے دین کی دعوت تمام انسانوں تک پہنچائیں۔ وہ اس کام کو نسل در نسل مسلسل جاری رکھیں۔ اس کام کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ دنیا میں مکمل مذہبی آزادی ہو۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں، بالفاظِ دیگر، داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوں۔

جہاں تک مذہبی آزادی کا تعلق ہے، قدیم زمانہ میں وہ موجود نہ تھی۔ اسی صورت حال کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے۔ اہل اسلام کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مذہبی عدم آزادی کی صورت حال کو ختم کر دیں۔ خواہ اس کے لیے اُنہیں مخالف طاقتوں سے لڑنا پڑے۔ یہی وہ حکم ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں دیا گیا ہے: **وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة** (اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے)۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اور اصحاب رسول نے اس حکم کی تعمیل فرمائی۔ اُنہوں نے زبردست جدوجہد کے ذریعہ عرب اور اطرافِ عرب میں مذہبی جبر کا خاتمہ کر دیا اور مذہبی آزادی کا دروازہ کھولا۔ اس طرح پہلی بار دنیا میں مذہبی آزادی کا دور شروع ہوا۔ یہ دور ایک عمل (process) کے روپ میں تاریخ میں جاری ہو گیا۔ مغربی تہذیب نے موجودہ زمانہ میں اس عمل کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ اب ساری دنیا میں مذہبی آزادی آ گئی۔ ہر ملک کے دستور میں مذہبی آزادی کی دفعات شامل کی گئیں۔ اقوام متحدہ کے منشور میں مذہبی آزادی کو انسان کا ناقابلِ تنسیخ حق قرار دیا گیا اور اس پر تمام قوموں کے نمائندوں نے اپنے دستخط ثبت کیے۔

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا تھا جس نے دس سال کے لیے ٹکراؤ کا خاتمہ کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے بعد عرب کے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں معتدل تعلقات قائم ہو گئے اور کھلا ڈائیلاگ شروع ہو گیا۔ باہمی تعلقات کے اسی نارملائزیشن کا یہ نتیجہ تھا کہ صرف چند برسوں میں پورے عرب میں اسلام پھیل گیا۔

موجودہ زمانہ میں اقوام متحدہ اور دوسرے بین اقوامی اداروں کے ذریعہ امن اور اعتدال کی جو

حالت قائم ہوئی ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے گویا ایک انٹرنیشنل صُلح حدیبیہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیکولرزم کی صورت میں ناطرفداری کا جو اجتماعی اصول ساری دنیا میں رائج ہوا ہے اُس نے عملاً اُسی چیز کا تحفہ انسانیت کو دیا ہے جو اسلام کے دور اول میں صلح حدیبیہ کے ذریعہ حاصل ہوا تھا۔ اس انقلابی تبدیلی نے اب دعوت کے تمام مواقع کھول دیے ہیں۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کسی بھی قسم کی رکاوٹ کے اندیشہ کے بغیر ہر ملک میں آزادانہ طور پر دعوت کا کام کیا جائے۔

یہ آزادی مغربی تہذیب کے زیر اثر حاصل ہوئی۔ یہ ایک مکمل آزادی ہے۔ آزادی کے ان مواقع کو استعمال کرنے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ داعی کسی بھی حال میں اور کسی بھی عذر کی بنا پر تشدد کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ وہ پوری طرح پُرامن دائرہ میں رہتے ہوئے اپنا دعوتی کام جاری رکھے۔

شعور اسلام یا اضافۂ ایمان

قرآن اور حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کوئی جامد چیز نہیں، وہ ایک اضافہ پذیر چیز ہے۔ ایمان ایک پودے کی مانند ہے جو اپنے گردوپیش کی دنیا سے غذا لے کر بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی آخری اونچائی تک پہنچ جاتا ہے (ابراہیم ۲۴)۔ اس اضافۂ ایمان کو دوسرے لفظوں میں شعوری ارتقاء (intellectual development) بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ اضافۂ ایمان یا ازدیادِ ایمان کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس اضافہ کا ذریعہ خدا کی یاد ہے۔ قرآن وسنت کا مطالعہ ہے۔ کائنات میں غور کرنا ہے۔ اپنے اندر تفکر اور تدبر اور توسم کی صلاحیت کو اتنا زیادہ بیدار کرنا ہے کہ گردوپیش کی پوری دنیا آدمی کے لیے ایک وسیع دسترخوان بن جائے جس سے ربّانی غذا لے کر آدمی اپنی دینی شخصیت میں اضافہ کرتا رہے۔

قدیم زمانہ کے خدا پرست افراد ہمیشہ اپنے ایمان میں اس قسم کے اضافے کرتے رہتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی تہذیب کے زیر اثر جو علمی انفجار (knowledge explosion) ہوا ہے اُس نے اضافۂ ایمان کی کوششوں کا دائرہ بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پچھلے زمانہ کا انسان روایتی فریم ورک (traditional framework) کے اندر اپنے شعور کو بیدار کرسکتا تھا اور اُس کے دائرہ میں

اضافۂ ایمان کی غذا حاصل کرتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس کا دائرہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ سائنٹفک فریم ورک کے زیادہ وسیع دائرہ میں اضافۂ ایمان کی خوراک حاصل کی جاسکے۔

مثال کے طور پر قدیم زمانہ کا انسان جب رات کے وقت کھلے آسمان کو دیکھتا تھا تو وہ برہنہ آنکھ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دس ہزار ستاروں کو گن سکتا تھا۔ مزید یہ کہ جن ستاروں کو وہ دیکھتا تھا، ظاہری مشاہدہ کے مطابق، وہ ان کو آسمانی چراغ جیسی چیز سمجھتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں دوربینی مشاہدہ نے بتایا ہے کہ آسمان میں ستاروں کی تعداد اُس سے بھی زیادہ ہے جتنا کہ تمام سمندروں کے کنارے ریت کے ذروں کی تعداد۔ نیز یہ کہ یہ ستارے اُس سے بہت زیادہ بڑے ہیں جتنا کہ وہ برہنہ آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں۔ سورج جو بظاہر بڑا دکھائی دیتا ہے وہ دوسرے ستاروں کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے۔ اس طرح ستاروں کے مشاہدہ سے ایمانی غذا لینے کا دائرہ اب بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

جدید سائنسی ترقی نے بتایا ہے کہ خلائی دنیا ناقابلِ قیاس حد تک وسیع ہے۔ اُس کی وسعت دہشت ناک حد تک بڑی ہے۔ اُس کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اُس کا تصور کرنے سے دماغ میں بھونچال آجائے اور جسم تھرتھرا اُٹھے۔ یہی پانی اور ہوا اور دوسری تمام کائناتی چیزوں کا معاملہ ہے۔ سائنس نے بتایا ہے کہ ہر چیز اتنی زیادہ عظیم اور عجیب ہے کہ اُس کا ابتدائی علم بھی انسان کو سراسیمہ کردینے کے لیے کافی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ تفصیلات حسب ذیل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں:

Man Does Not Stand Alone by Cressy Morrison

موجودہ زمانہ میں اس قسم کی بے شمار دریافتیں ہوئی ہیں جنھوں نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ زیادہ وسیع دائرہ میں سوچے۔ وہ زیادہ وسیع معلومات کی روشنی میں چیزوں کو دیکھ سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آج کا انسان اس پوزیشن میں ہوگیا ہے کہ وہ خدا کی تخلیقات میں زیادہ گہرائی کے ساتھ ازدیادِ ایمان کا وہ عمل کرسکے جس کو قرآن میں تفکر اور تدبر اور توسم کہا گیا ہے۔ تفکر و تدبر کے یہ نئے مواقع کس نے پیدا کئے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مغربی تہذیب کے تحت پیدا ہونے والی جدید سائنس نے۔

خلاصۂ کلام

جدید مغربی تہذیب اسلام دشمن تہذیب کے طور پر نہیں ابھری وہ خود اپنی مثبت طاقت کے زور پر پیدا ہوئی۔ تاہم اسی کے ساتھ اس میں کچھ ایسے غیر مطلوب اجزاء شامل ہو گئے جنھوں نے مغربی تہذیب اور مسلم دنیا کے درمیان تلخی پیدا کر دی۔ اس تلخی کے اسباب دونوں طرف تھے، مغربی تہذیب کی طرف بھی اور مسلمانوں کی طرف بھی۔

مگر یہ صورت حال مسلم علماء اور دانشوروں کے لیے کوئی عذر فراہم نہیں کرتی۔ اس ناخوشگوار صورت حال کے باوجود مسلم علماء اور مسلم دانشوروں کا فرض تھا کہ وہ مغربی تہذیب کے حقیقی پہلو اور اس کے اضافی پہلو کے فرق کو سمجھیں۔ وہ اضافی پہلو کو نظر انداز کر کے اس کے اصل پہلو کو دیکھیں اور اس کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

یہ غلطی جو ماضی میں کی گئی وہ بلاشبہہ نہایت مہلک تھی۔ مغربی تہذیب اسلام کی تائید کے طور پر ابھری تھی مگر اہل اسلام نے غلط فہمی کی بنا پر اس کو اپنا دشمن سمجھ لیا۔ وہ **الناس اعداء ما جھلوا** کے مصداق بن گئے۔

اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اس امکان کو واقعہ بنایا جائے۔ مسلم علماء اور دانشوروں کو چاہئے کہ وہ اپنی غلطی کا احساس کریں۔ وہ اکیسویں صدی میں اس غلطی کو نہ دہرائیں جس کا ارتکاب وہ بیسویں صدی میں کرتے رہے ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کر کے اسلام کی جدید تاریخ بنائیں۔ یہ مواقع ماضی میں بھی خدا کے دین کے لیے تھے اور آج بھی وہ خدا کے دین کے لیے ہیں۔ مسلمان صدیوں سے اونٹ اور گھوڑے پر یہ کہہ کر سواری کرتے رہے ہیں کہ: **سبحان الذی سخر لنا ھذا وما کنا لہ مقرنین**۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس دعا کا نیا استعمال دریافت کریں۔ وہ صنعتی دور کی طاقتوں کو کلمۂ اسلام کی سربلندی کے لیے استعمال کرنے کا ثبوت دیں اور اس طرح دنیا اور آخرت میں خدا کی نصرتوں کے مستحق بنیں۔ (نئی دہلی، ۱۰ اگست ۲۰۰۴)

ایک مردِ مومن

حیدرآباد سے جناب واسم احمد خاں ایڈوکیٹ نے ٹیلی فون پر بتایا کہ ان کے والد ڈاکٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴ کو ۷۴ سال کی عمر میں انتقال کر گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی وفات ایک سچے انسان کی وفات ہے۔ میرے ذاتی تجربہ کے مطابق، وہ اعلیٰ انسانی اوصاف کا ایک نمونہ تھے۔ وہ ان نادر انسانوں میں سے تھے جن کے بارے میں محفوظ طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس نے ان کو دیکھا اس نے گویا ایک جنتی انسان کو زمین پر چلتے پھرتے دیکھ لیا۔

ڈاکٹر عزیز احمد خاں مرحوم میں جو اعلیٰ صفات پائی جاتی تھیں ان میں سے ایک صفت وہ ہے جس کا ذاتی طور پر مجھے تجربہ ہوا۔ وہ صفت ہے، صاحب حق کی حمایت۔ دنیا میں ایسے ہزاروں لوگ ہیں جو کسی حق کو اشو بنا کر اس کے نام پر جھنڈا اٹھاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب حق کے نام پر لیڈری کرنا ہے۔ مگر ایک صاحب حق کی حمایت کے لیے اس کے ساتھ کھڑا ہونا بلاشبہہ اسلامی کردار کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ میں ایک شخص کے کیس کو جانتا ہوں۔ وہ ایک مالیاتی زیادتی کا شکار ہوا۔ مگر سارے شہر میں کوئی بھی نہیں نکلا جو اس شخص کی حمایت میں کھڑا ہو۔ جو حقدار کی کھلی حمایت کرے اور زیادتی کرنے والے کی کھلی مذمت کرے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف پورے شہر میں واحد شخص تھے جس نے کسی بھی قسم کے انٹرسٹ کے بغیر اس حق دار آدمی کا قولی اور عملی دونوں اعتبار سے ساتھ دیا۔ انہوں نے اس معاملہ میں کسی مصلحت کی کوئی پروا نہیں کی۔

پچھلے پچاس سال سے بھی زیادہ لمبی مدت کے دوران مجھ کو جو تجربات ہوئے اس کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ مسلمانوں میں میں نے ایسے لوگ بہت دیکھے جو ایک حق کے سوال کو عوامی اشو بنا کر اس پر تحریکیں چلاتے ہیں اور اس پر ہنگامے کھڑے کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کی تحریکیں اپنی حقیقت کے اعتبار سے قیادت کے ہنگامے ہیں، وہ حق کی حمایت ہرگز نہیں۔ کسی حق کے اشو پر تحریکیں چلانا اور ایک حق دار فرد کی بے غرض حمایت کرنا، دونوں کے درمیان اتنا زیادہ

فرق ہے کہ ایک اگر بے دینی ہے تو دوسرا دین داری۔

میں کم از کم اپنے تجربہ کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ اپنی عمر میں میں نے شاید کسی بھی مسلمان کو نہیں پایا جو ایک حق دار فرد کے مسئلہ پر تڑپے اور مصلحتوں سے اوپر اٹھ کر اس کا بھرپور ساتھ دے۔ البتہ ہندوؤں میں میں نے اپنے تجربہ کے مطابق کئی ایسے افراد دیکھے ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی کے رام رتن کپلا (وفات ۲۰۰۱) اور موتی لال صرّاف (وفات ۱۹۹۴)۔

اصلاح معاشرہ کے نام پر جلسہ جلوس کی تحریکیں چلانے سے معاشرہ کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ جب بھی کسی فرد پر کوئی شخص زیادتی کرے تو اس میں بروقت دخل دے کر زیادتی کو ختم کیا جائے۔ زیر زیادتی شخص کی حمایت کر کے انصاف قائم کیا جائے۔

ایک اور نادر انسانی صفت جو میں نے ڈاکٹر عزیز احمد مرحوم میں دیکھی وہ ان کی تعلیمی خدمت تھی۔ دوبارہ میں کہوں گا کہ تعلیم کے اشو پر قیادت کرنے والے تو بہت ہیں مگر تعلیم کے لیے حقیقی خدمت کرنے والے بہت کم۔ انہی میں سے ایک ڈاکٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ تھے۔ وہ تعلیم کی اہمیت کو بخوبی طور پر سمجھتے تھے۔ وہ اس کے لیے سچا درد رکھتے تھے۔ انہوں نے خاموشی کے ساتھ ایک بہت بڑا کام کیا۔ انہوں نے اپنے گھر کو ایک فری کوچنگ سنٹر میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے بہت سے لڑکے اور لڑکیوں کی ذاتی طور پر کوچنگ کر کے انہیں پڑھایا اور ان کو اعلیٰ تعلیم کے درجہ تک پہنچایا۔ وہ اس کام کو کسی ماڈی انٹرسٹ کے بغیر لمبی مدت تک چلاتے رہے۔ اس طرح محض اپنی ذاتی کوشش سے انہوں نے بہت سے گھروں کو تعلیم یافتہ بنا دیا۔ اخبار میں چھپنے والے خادمان ملت تو بہت ہیں مگر اخباری شہرت سے دور رہ کر ملّی خدمت کرنے کی یہ ایک انوکھی مثال تھی جس کا مشاہدہ میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی زندگی میں کیا۔

آج ہماری ملّت کو سب سے زیادہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ اگر ملّت کے صاحب حیثیت افراد ڈاکٹر عزیز احمد مرحوم کے نمونہ پر عمل کریں تو بہت تھوڑی مدت میں پوری ملّت تعلیم یافتہ بن جائے۔

ڈاکٹر عزیز احمد خاں مرحوم کی ایک اور صفت جو میرے علم میں آئی وہ تھی — بے غرض انسانی خدمت۔ موصوف بظاہر وکالت کے پیشہ سے تعلق رکھتے تھے مگر وکالت کے کام کو وہ زیادہ تر انسانی خدمت کے جذبہ کے تحت انجام دیتے تھے۔ موکل کا استحصال تو درکنار وہ موکل سے واجبی فیس کا تقاضہ بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے سامنے فیس سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ اپنے موکل کی پوری قانونی مدد کریں۔

اسی طرح موصوف ہومیوپیتھی کے ایک اچھے ڈاکٹر تھے۔ وہ اپنے خالی اوقات میں لوگوں کو دوائیں دیتے تھے۔ یہ کام بھی وہ کسی معاوضہ کے بغیر صرف انسانی خدمت کے جذبہ کے تحت کرتے تھے۔ مجھ سے کئی لوگوں نے بتایا کہ ڈاکٹر عزیز احمد خاں کے علاج سے وہ پوری طرح شفایاب ہوگئے، جب کہ لمبے علاج کے بعد وہ اپنی صحت کے بارے میں مایوس ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ کو مطالعہ اور تحریر سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کچھ کتابیں تیار کیں اور ان کو شائع کیا۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے: اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریۂ علم وسائنس۔

اس کتاب میں یونانی فلسفہ سے لے کر جدید دور کی سائنس تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں مذہب کے موافق اور مخالف رایوں کو لے کر مختلف تاریخی شخصیتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے ایک باب کا عنوان یہ ہے: سائنس داں جو اللہ کے قائل تھے۔ اس باب میں سر آرتھر ایڈنگٹن کی کتاب سائنس اینڈ ان سین ورلڈ (Science and Unseen World) کے حوالہ سے ایک سبق آموز واقعہ نقل کیا گیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے:

ایک مرتبہ نیوٹن (۱۶۴۲-۱۷۲۶) اپنے کمرہ میں کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے نظام شمسی کا ایک دھاتی نمونہ جس کو کسی کاریگر نے بڑی مہارت اور قابلیت سے بنایا تھا، رکھا ہوا تھا۔ اس کو جب گھمایا جاتا تو تمام سیارے اپنی اپنی رفتار کے تناسب سے گھومنے لگتے تھے۔ بظاہر یہ عجیب وغریب منظر پیش کرتا تھا۔ نیوٹن کا ایک سائنس داں دوست جو ماحول سے متاثر ہو کر خدا کا منکر ہو گیا تھا، نیوٹن کے کمرہ میں داخل ہوا اور نظام شمسی کے اس نمونہ کو دیکھ کر بے اختیار پوچھا ''اس کو کس

نے بنایا ہے'' نیوٹن نے سوال سن کر اپنے دوست کی طرف دیکھے بغیر کہا ''کسی نے بھی نہیں'' سائنس داں نے کہا'' آپ نے میرا مطلب نہیں سمجھا'' نیوٹن نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر اپنے دوست سے کہا ''نہیں کسی نے بھی نہیں بنایا، جس چیز کو تم اتنی حیرت سے دیکھ رہے ہو اس نے خود بخود اپنی یہ شکل اختیار کر لی ہے''۔ نیوٹن کے اس جواب میں طنز تھا۔ مگر اس جواب نے سائنس داں کو مضطرب کر دیا۔ اس نے جھلاتے ہوئے کہا،'' کیا تم مجھے بیوقوف سمجھ رہے ہو۔ بے شک اس کو کسی نے بنایا ہے اور وہ بنانے والا کوئی نہایت ماہر کاریگر ہے۔ میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں''۔ اپنی کتاب کو الگ رکھتے ہوئے نیوٹن کھڑا ہو گیا۔ اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا،'' یہ نمونہ ایک ادنیٰ نقل ہے اس شاندار نظام کائنات یعنی نظام شمسی کی جس کے قانون سے تم واقف ہو۔ اور میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم کو قائل کر سکوں۔ یہ معمولی کھلونا بغیر کاریگر کے خود بخود وجود میں آیا''۔ نیوٹن نے اپنے دوست سے کہا کہ'' تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیسے اس نظریے پر پہنچے کہ وہ شاندار نظام بغیر خالق کے وجود میں آ گیا ہے۔'' نیوٹن کا دوست سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہ دے سکا۔ نیوٹن نے بات جاری رکھتے ہوئے اپنے دوست کو بتایا کہ:'' اس شاندار نظام کا خالق خدا ہے اور جو بغیر خدا کے سمجھتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔'' (صفحہ ۱۴۸۔۱۴۹)

اللہ کی عظمت نامی یہ کتاب ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ وہ پہلی بار فروری ۱۹۸۶ میں چھپی۔ کتاب پر مندرجہ ذیل پتہ درج ہے:

ثمنی پبلیکیشنز، چلکل گوڑہ، سکندرآباد، ۵۰۰۳۶۱

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے کئی بار میری خط و کتابت ہوئی تھی۔ یہ خطوط ان کی شخصیت کا تحریری تعارف ہیں۔ ڈاکٹر مرحوم کا ایک خط اور میری طرف سے اس کا جواب یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

محترمی ومکرمی مولانا وحید الدین خاں صاحب

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کی خیریت الرسالہ ہمیشہ دیتا رہتا ہے۔ آپ کا الرسالہ (عراق نمبر) دو تین مرتبہ پڑھا۔ آپ نے جو تبصرے کیے ہیں وہ بے حد پسند آئے۔ اور شاید یہ

باتیں کسی کے ذہن ودماغ میں بھی نہ آئی ہوں۔

دوسرے یہ کہ میں بہت روز سے علیل ہوں۔ ہاتھوں میں رعشہ کی وجہ سے لکھنا مشکل ہوگیا ہے۔ کئی روز سے آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا مگر وقت کچھ انتظار میں اور کچھ دواخانوں کے چکر میں گزر گیا۔ دعا فرمایئے کہ میں صحت یاب ہوجاؤں۔

تیسری بات یہ ہے کہ میری نواسی عزیزہ شاذاں جو آٹھ دس سال قبل دہلی آئی تھی اور آپ سے دعاؤں کا شرف بھی حاصل کرچکی ہے، اس کی شادی ۶ رجولائی کو مقرر ہوگئی ہے۔ اس کی ماں کا بے حد اصرار ہے۔ میں آپ کو شادی میں آنے کی زحمت تو نہیں دے سکتا مگر آپ سے التجا کرکے آپ کی دعاؤں کا طلب گار بنوں۔

امید کہ آپ اس کی کامیاب زندگی کے لیے دعا فرمائیں گے۔ (عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ، سکندرآباد، ۲۸ جون ۲۰۰۳)

جواب

برادر محترم ومکرم ڈاکٹر عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط مورخہ ۲۸ جون ۲۰۰۳ ملا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحتِ کامل عطا فرمائے۔ آپ کو ہر طرح امن اور عافیت کے ساتھ رکھے اور تمام اہل خانہ کا ہر طرح مددگار رہو۔

عزیزہ شاذاں کی شادی کی خبر سے خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس رشتہ کو مبارک کرے اور کامیاب زندگی عطا فرمائے۔ میری طرف سے عزیزہ کو دعا اور مبارک باد۔

شادی زندگی کا ایک ایسا مرحلہ ہے جو ہر مرد اور عورت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے اور جب شادی خود فطرت کا قانون ہو تو خود فطرت میں اس کی ضمانت ہونی چاہیے کہ شادی طرفین کے لیے پرسکون زندگی کی ضمانت بنے۔

میرے نزدیک شادی شدہ زندگی کی کامیابی کا راز صرف ایک ہے اور وہ ایڈجسٹمنٹ

ہے۔ایڈجسٹمنٹ شادی شدہ زندگی کی کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔اصل یہ ہے کہ خالق نے ہر مرد اور عورت کو مسٹر ڈفرنٹ اور مز ڈفرنٹ کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ڈفرینس خود فطرت کا لازمی حصّہ ہے اور جب دو ڈفرنٹ پرسن باہم ملیں تو کامیاب زندگی کی ضمانت صرف یہ ہوسکتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کر کے زندگی گذاریں۔اس معاملہ میں فریقین کے لیے ایڈجسٹمنٹ کے سوا کوئی اور آپشن نہیں۔

یہ ڈفرینس ایک عظیم نعمت ہے۔اس ڈفرینس کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ دو شخصوں کے درمیان تبادلۂ خیال ہو اور تبادلۂ خیال کے ذریعہ ذہنی ارتقاء کا عمل جاری رہے۔میرے تصور میں بہترین بیوی اور بہترین شوہر وہ ہے جو ایک دوسرے کے لیے انٹیلیکچول پارٹنر بن سکے۔اگر فریقین میں مثبت مزاج ہو تو ڈفرینس سے انٹیلیکچول ایکسچینج پیدا ہوگا اور انٹیلیکچول ایکسچینج سے انٹیلیکچول ڈیولپمنٹ کا عمل جاری رہے گا۔عزیزہ شاذاں کو ان کی زندگی کا یہ نیا دور مبارک ہو۔

یکم جولائی ۲۰۰۳ دعا گو وحیدالدین

۱۔ کناڈا سے مسٹر آصف کا خط مورخہ ۱۴ فروری ۲۰۰۴ موصول ہوا۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے:

Last Sunday Feb. 8th. Noor Cultural Centre in Toronto had organized a lecture by Dr. Scott Kugle, a research scholar, Duke University, North Carolina. His Email address: Skugle1@swarthmore.edu

His topic of the lecture was: Non-Violence in Qur'an. It was a very interesting and informative lecture. The audience throughly enjoyed it. From his lecture I assumed that Dr. Scott is a Muslim and has embraced Islam.

In his discourse he talked about the various personalities of India and Pakistan who preached the idea of non-violence in their struggles to remove British from India. He talked in detail about the lives and struggles of Maulana Abul Kalam Azad and Abdul Gaffar Khan.

Then to my pleasant surprise he said, "There is a present day Muslim Scholar-Maulana Wahiduddin Khan-who is also in his books advocates non-violence. He said that Maulana Wahiduddin Khan has written many good books."

After the lecture I went to him and introduced myself. I said I teach Arabic once a week here at the Noor Cultural Centre and that we import books and sell them at cost price so that every one can easily afford them. I said that we import from Goodword Books almost all the books written by Maulana Wahiduddin Khan and they are always available with us and at the prices which are so affordable to everyone.

He was quite surprised to learn this. He has taken my email address. He said that when he comes to Toronto next time Insha Allah he will visit the new NON-PROFIT BOOKSTORE. (Asif, Canada)

۲۔ ویکلی سہارا (نئی دہلی) کے سب ایڈیٹر محمد اصغر فریدی نے ۲ مارچ ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر الیکشن اور مسلمان کے موضوع سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ الیکشن کے موقع پر کس پارٹی کو ووٹ دیا جائے اور کس پارٹی کو ووٹ نہ دیا جائے، اس کا تعلق عقیدہ یا مذہب سے نہیں ہے بلکہ ملّی مفادات سے ہے۔ یہ مفادات بھی ابدی نوعیت کے نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں احتجاجی سیاست بالکل بے معنٰی ہے:

Politics is an art of bargaining, rather than
an art of protesting and complaining.

ایک بات یہ کہی گئی کہ جمہوری نظام میں کسی پارٹی کو سیاسی اچھوت بنانا کوئی مفید پالیسی نہیں۔ مزید یہ کہ الیکشن کے موقع پر لمبی مدّت کے لیے کسی ملّی مفاد کا حصول ممکن نہیں۔ ایسے موقع پر صرف محدود نوعیت کا کوئی مفاد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ الیکشن کی اس نوعیت کو لوگ اپنے ذاتی مفاد کے معاملہ میں خوب جانتے ہیں اور اس کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب معاملہ ملّی مفاد کا ہو تو ہر آدمی بڑی بڑی تقریر کرنے لگتا ہے۔ اس قسم کی تقریریں صرف مقرر کی غیر سنجیدگی کا ثبوت ہیں۔

۳۔ مسٹر عرفان احمد، ایم اے ایمسٹرڈم یونیورسٹی میں سوشل سائنس ریسرچ کے تحت ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین کے نظریات وافکار کا مطالعہ کررہے ہیں تاکہ اس کی روشنی میں اپنا مقالہ مرتب کریں۔ اس سلسلہ میں وہ ۲ مارچ ۲۰۰۴ کو نئی دہلی میں صدر اسلامی مرکز سے ملے اور موضوع سے متعلق اُن کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین مثبت طرزِ فکر کے حامل نہ تھے، اُن کا فکر وقت کے سیاسی حالات کے ردّعمل میں بنا۔ اس لیے یہ لوگ اسلام کی مثبت ترجمانی میں کامیاب نہ ہوسکے۔ سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ صحیح اسلامی تفکیر وہ ہے جو وقتی حالات سے متاثر ہوئے بغیر اسلام کی دوامی تعلیمات کی روشنی میں بنائی جائے۔ اپنے اسی منفی فکر کی بنا پر موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اسلام کی کوئی مثبت خدمت نہ کرسکے۔

۴۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) نے ۱۱ مارچ ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ایک مفتی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ جو مسلمان بندے ماترم میں شریک ہوں یا بی جے پی کا ساتھ دیں وہ خارج از اسلام ہیں۔ اس کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ اس قسم کا فتویٰ لا تکفر من اھل القبلہ کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں۔

۵۔ دہلی پریس پرکاشن لمیٹڈ (نئی دہلی) کی طرف سے ایک انگریزی میگزین اَلائیو (Alive) کے نام سے نکلتا ہے (اس کا سابقہ نام کارواں تھا) اس میگزین کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر رام بلاس کمار نے ۱۱ مارچ ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم پالیٹکس سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ برصغیر ہند میں بدقسمتی سے ۱۰۰ سال سے بھی زیادہ مدت سے ایسے رہنما اٹھے جو صرف حالات کے ردّعمل کی پیداوار تھے۔ چنانچہ ان کی سوچ منفی سوچ تھی۔ وہ ملت کو کوئی مثبت ایجنڈا نہ دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اب تک شکایت اور احتجاج کے احساس میں جیتے ہیں۔ الیکشن کے موقع پر وہ ہمیشہ نگیٹیو ووٹنگ کرتے ہیں۔ یعنی کسی پارٹی کو اینٹی مسلم پارٹی فرض کرکے اس کے خلاف ووٹ دینا۔ ہمارا مشن یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے اندر مثبت سوچ لائیں۔ دوسروں کی شکایت کے بجائے خود تعمیری کا مزاج پیدا کریں۔

۶۔ ایران کلچر ہاؤس اور ہمدرد یونیورسٹی (نئی دہلی) کے تعاون سے ۱۲ مارچ ۲۰۰۴ کو قرآنی علوم (Qur'anic sciences) پر ایک سیمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس میں ایک بات یہ بتائی کہ سائنسی تعلیم کی اہمیت صرف مادی ترقی کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ قرآن کو جدید تناظر میں سمجھنا اور جدید نسلوں کے لیے اسلام کو زیادہ قابل فہم بنانا، اس سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔

۷۔ انجمن امن دوست انسان دوست (نئی دہلی) کے تحت راشٹر شکتی فاؤنڈیشن کا سالانہ جلسہ ۱۴ مارچ ۲۰۰۴ کو میر درد روڈ (مہندیان) میں ہوا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ اس جلسہ میں وہ بعض اسباب سے نہ جاسکے۔ البتہ انہوں نے ایک تحریری پیغام ان کے لیے بھیج دیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ آج کے ماحول میں انسان دوستی اور امن دوستی کا پیغام بے حد اہم ہے۔ تعمیری سماج بنانے کے لیے یہ دو بنیادی نکتے ہیں۔

۸۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۲۲ مارچ ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اُن کا خاص سوال یہ تھا کہ اخبارات (مثلاً ٹائمس آف انڈیا ۲۱ مارچ ۲۰۰۴) میں یہ خبر چھپی ہے کہ بی جے پی کے لیڈر مسٹر پرمود مہاجن کی رہائش گاہ (نئی دہلی) پر ایک میٹنگ ہوئی جس میں پرائم منسٹر کے اسپیشل سکریٹری مسٹر کلکرنی بھی موجود تھے۔ اس میں آپ نے شرکت کی اور وہاں ایک تقریر کی۔ آپ کی اس شرکت کو بی جے پی کی حمایت کے معنٰی میں لیا جارہا ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ یہ شرکت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ الرسالہ مشن کا ایک حصہ تھا۔ الرسالہ کا مشن یہ ہے کہ ہندستان میں ہندو۔ مسلم اتحاد پیدا کیا جائے۔ مسلمانوں میں دوقومی نظریہ کا ذہن ختم کیا جائے اور اس سوچ کو ختم کیا جائے کہ ہندستان دارالکفر یا دارالحرب ہے۔ بلکہ لوگوں کے اندر یہ ذہن پیدا کیا جائے کہ ہندستان دارالانسان ہے۔ کسی کو اینٹی مسلم قرار دے کر اُس سے کٹنا داعی کے لیے جائز نہیں۔ داعی ہر ایک کو مدعو کی نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ ہر ملک کو دارالدعوہ سمجھتا ہے۔ یہی الرسالہ کا مشن ہے اور یہ مشن پچھلے تیس سال سے یہاں چلایا جارہا ہے۔

۹۔ بی بی سی انگریزی (اسکاٹ لینڈ) کی ٹیم ۲۳ مارچ ۲۰۰۴ کو اسلامی مرکز میں آئی۔ اس کی قیادت مارک رچرڈ (Mark Richards) کررہے تھے جو کہ بی بی سی میں سینئر پروڈیوسر فیچرس ہیں۔ انہوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر صوفی اسلام اور اس سے تعلق رکھنے والے موضوعات سے تھا۔ مثلاً اسلام میں روحانیت کا تصور۔ اسلام میں میوزک اور قوالی کا تصور وغیرہ۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ روحانیت اسلام کی اصل اسپرٹ ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر روحانیت اور ربانیت پیدا کی جائے۔ جہاں تک میوزک اور قوالی کا تعلق ہے اس کو کچھ صوفیاء نے رواج دیا۔ اس سے صوفیاء کا مقصد یہ تھا کہ عوام کو اس کے ذریعہ سے اسلام کی طرف راغب کیا جائے۔ تاہم اس کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ جہاں تک علماء کا تعلق ہے وہ میوزک اور قوالی وغیرہ کو پسند نہیں کرتے۔ مگر صوفیاء اس کو روحانیت پیدا کرنے کے لیے

ایک مددگار ذریعہ سمجھتے ہیں۔(Tel.: 0141-3382721)

۱۰۔ رائٹر نیوز ایجنسی کی نمائندہ مزماریہ ابراہام نے بمبئی سے بذریعہ ٹیلی فون صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کی انتخابی پالیسی سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں اب بڑے پیمانہ پر نئی سوچ آئی ہے۔ وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو زیادہ منصوبہ بند انداز میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ انٹرویو ۲۵ مارچ ۲۰۰۴ کو لیا گیا۔

۱۱۔ فکّی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ۲۵ مارچ ۲۰۰۴ کو ایک عمومی جلسہ ہوا۔ اس میں مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اس جلسہ کا موضوع یہ تھا کہ مسلمانوں کی الیکشن پالیسی کیا ہو۔ صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ مسلمان اب تک زیادہ تر نگیٹیو ووٹنگ کرتے رہے ہیں۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ وہ پازیٹیو ووٹنگ کریں اور ملک میں اپنا تعمیری کردار ادا کریں اور اپنے آپ کو تخلیقی اقلیت ثابت کریں۔

۱۲۔ ہندی روزنامہ دینک جاگرن (نئی دہلی) کے اسپیشل کرسپانڈنٹ مسٹر راج کشور نے ۳۱ مارچ ۲۰۰۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسلمانوں کی انتخابی پالیسی کیا ہے۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی انتخابی پالیسی اب کسی قدر بدلی ہے۔ مگر ابھی بہت زیادہ نہیں بدلی ہے۔ مسلمانوں کے اندر منفی سیاست کا رجحان ختم کر کے مثبت سیاست کا رجحان لانے کے لیے لمبے کام کی ضرورت ہے۔

۱۳۔ انگریزی میگزین ٹائم (Time) کے کرسپانڈنٹ مسٹر اروند ادیگا (Aravind Adiga) نے ۱۴ اپریل ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کا تعلق زیادہ تر جدید دنیا اور مسلمان سے تھا، مثلاً اجتہاد اور ریفارم اور جہاد اور مسلم اور غیر مسلم کے تعلقات اور مغربی دنیا کے بارے میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر، وغیرہ۔ سوالات کے جواب میں انہیں بتایا گیا کہ بہت سی چیزیں جن کو مغربی میڈیا میں منفی انداز میں پیش کیا جاتا ہے اور ان کو اسلام سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل مسلمانوں کا اپنا فعل ہے نہ کہ اسلام کی اصولی تعلیم۔ دوسری قوموں سے مسلمانوں کی نفرت سراسر غیر اسلامی ہے کیوں کہ اس قسم کی نفرت اسلام میں جائز ہی نہیں۔ آج کل جہاد کے نام پر جو تشدد کیا جا رہا ہے وہ بھی غیر اسلامی ہے کیوں کہ اسلام میں مسلح جہاد صرف حکومت کا حق ہے نہ کہ عوام کا حق۔ دوسرے ممالک ہمارے لیے دار الحرب یا دار الکفر نہیں ہیں بلکہ وہ دار الانسان ہیں۔

۱۴۔ سہارا ٹی وی (نئی دہلی) کے ایک پروگرام کے تحت صدر اسلامی مرکز نے اس کے ایک پینل ڈسکشن میں حصہ لیا۔ اس کا موضوع الیکشن کے حوالہ سے مسلمان اور پالیٹکس تھا۔ اس میں چار افراد نے حصہ لیا۔ یہ پروگرام ۱۶ اپریل ۲۰۰۴ کو ہوا۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا گیا کہ مسلمانوں میں اب ایک نئی سیاسی سوچ اُبھر رہی ہے۔ وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ نگیٹیو ووٹنگ کا طریقہ صحیح نہیں۔ نیز یہ بھی صحیح نہیں کہ سیاسی پارٹیوں کو مسلم دشمن

اور مسلم نواز کے اعتبار سے بانٹا جائے۔ الیکشن میں جمہوریت کی اسپرٹ کے تحت حصہ لینا چاہیے۔ اسی میں ملک کا بھی فائدہ ہے اور اسی میں مسلمانوں کا فائدہ بھی۔

۱۵۔ اچاریہ سوشیل کمار آشرم (نئی دہلی) میں ۱۸ اپریل ۲۰۰۴ کو ایک جلسہ ہوا۔ یہ مختلف مذاہب میں امن کے اشو پر تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ان اللّٰہ یعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف کی روشنی میں بتایا کہ خدا کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں صرف امن کا طریقہ ہی موثر اور نتیجہ خیز ہے۔ تشدد کا طریقہ کبھی کوئی مثبت نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔

۱۶۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) میں ۲۴ اپریل ۲۰۰۴ کو ایک پینل ڈسکشن تھا۔ اس میں کئی لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ مسلمان اور جدید میڈیا پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میڈیا سے شکایت کرنا بے فائدہ ہے۔ میڈیا ایک انڈسٹری ہے۔ اپنے انٹرسٹ کے تحت وہ سافٹ نیوز کو چھوڑتا ہے اور ہارڈ نیوز کو لیتا ہے۔ خود مسلمان ان مسلم افراد کی مذمت کریں جو اسلام کے نام سے تشدد کرتے ہیں اور میڈیا کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں۔

۱۷۔ ہندی روزنامہ ہندستان (نئی دہلی) کے رپورٹر فضل غفران نے ۲۵ اپریل ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمان اور الیکشن سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ سیاست کوئی عقیدہ کی چیز نہیں۔ وہ عملی زندگی کا ایک مسئلہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ملی اور مذہبی مقاصد کو خود اپنے اداروں کے تحت حل کریں۔ سیاست میں انہیں نیشنل اسپرٹ کے ساتھ حصہ لینا چاہیے۔ ان کو چاہیے کہ وہ پولیٹکل پارٹی کو سپورٹ دیتے ہوئے پورے ملک کے مفاد کو سامنے رکھیں۔ ملک کے سیاسی اور اقتصادی مفاد ہی میں مسلمانوں کا سیاسی اور اقتصادی مفاد بھی ہے۔ کسی پولیٹکل پارٹی کو پرو مسلم اور کسی پولیٹکل پارٹی کو اینٹی مسلم قرار دے کر اپنا سیاسی پروگرام بنانا جمہوریت میں قابل عمل ہی نہیں۔

۱۸۔ نئی دہلی کے میگزین آؤٹ لک (ہندی ایڈیشن) کی نمائندہ مزگیتا شری نے ۲۷ اپریل ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلی فون پر ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم سیاست سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ انڈیا میں جو پولیٹکل پارٹیاں ہیں ان کو پرو مسلم اور اینٹی مسلم میں بانٹنا درست نہیں۔ یہ جمہوری اسپرٹ کے خلاف ہے۔ ہر پارٹی کا اپنا سیاسی انٹرسٹ ہے۔ کوئی بھی پارٹی اینٹی مسلم پارٹی نہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ملک کے تمام لوگوں کو انسان سمجھیں۔ الیکشن کے موقع پر ووٹ دینے میں وہ ملک کے انٹرسٹ کو سامنے رکھ کر ووٹ دیں۔ نہ کہ اس نظریہ کے تحت کہ فلاں پارٹی اینٹی مسلم ہے اور اس کو ہمیں ہرانا ہے۔

۱۹۔ انڈیا ٹوڈے (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر منوج ورما نے ۲۷ اپریل ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی

انٹرویولیا۔ یہ انٹرویو ٹیلی فون پر ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر انتخابی سیاست اور مسلمان سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے حالات کے اعتبار سے اس قسم کی سیاست کا تحمل نہیں کر سکتے کہ وہ ایک پولیٹکل پارٹی کو پرو مسلم اور دوسری پولیٹکل پارٹی کو اینٹی مسلم ڈکلیر کریں اور اس کے مطابق اپنی سیاست چلائیں۔ انہیں ہر پولیٹکل پارٹی کو انسان پارٹی کی حیثیت سے لینا ہے۔ انہیں منفی سوچ کو چھوڑ کر مثبت سوچ کے تحت اپنی پالیسی بنانا ہے۔ دوسری بات یہ کہی گئی کہ مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی تعلیمی پس ماندگی ہے۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھایا جائے۔ اس کے بغیر ان کا کوئی مسئلہ حل نہ ہوگا۔ بیلٹ باکس سے ان کی قسمت برآمد نہیں ہوسکتی۔

۲۰۔ ہندی روزنامہ دینک بھاسکر کے نمائندہ مسٹر سنجے کمار ساہ (Sanjay Kumar) نے ۲۸ اپریل ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات کا تعلق عید میلا دالنبی سے تھا۔ جواب میں بتایا گیا کہ عید میلا دالنبی دراصل ہندوؤں کے تہوار جنم اسٹمی کی نقل ہے۔ اسلام میں صرف دو تہوار ہیں — عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ ان کے سوا جو اور تہوار مسلمان مناتے ہیں وہ ان کا اپنا رواج ہے۔ وہ اسلام کی تعلیم نہیں۔ (Tel. 9899237833)

۲۱۔ ہندی روزنامہ نو بھارت ٹائمز کے نمائندہ مسٹر سنجے ورما نے ۲۸ اپریل ۲۰۰۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر موجودہ الیکشن اور اس میں مسلمانوں کا حصہ کے بارے میں تھا۔ جوابات کے دوران بتایا گیا کہ آج کل بعض نام نہاد مسلم رہنما جو اپیل کر رہے ہیں کہ مسلمان بی جے پی کو ووٹ دیں اس کا کوئی اثر عملی طور پر ہونے والا نہیں۔ اس لیے کہ یہ نام نہاد رہنما وہی ہیں جو اس سے پہلے برابر یہ کہتے رہے ہیں کہ بی جے پی مسلم دشمن پارٹی ہے اور مسلمانوں کو اسے ہرانا ہے۔ ایسی حالت میں ان کی یہ نئی بات اسی وقت موثر ہوسکتی ہے جب کہ وہ اپنی موجودہ اپیل سے پہلے یہ اعلان کریں کہ اس سے پہلے ہم نادانی میں مبتلا تھے، اب ہم کو سمجھ آئی ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کئے بغیر اس قسم کی اپیلوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ کوئی بھی مسلمان موجودہ حالت میں اس کو سنجیدگی سے نہیں لے سکتا۔ اپیل کرنے والا جب اپنی اپیل کی کوئی معقول وجہ نہ بتا رہا ہو تو اس کو سننے والے کیوں کر اسے اہمیت دے سکتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے اندر منفی سیاست کا ذہن پیدا کیا ہے۔ اب اسی ذہن کو مثبت سیاست پر لانے کے لیے کوئی معقول وجہ بتانی پڑے گی۔ محض موجودہ قسم کی اپیل اس معاملہ میں موثر نہیں ہوسکتی۔

۲۲۔ نئی دہلی کے ای ٹی وی (Enadu TV) کی ٹیم نے ۲ مئی ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع عید میلا دالنبی تھا۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا کہ عید میلا دالنبی کوئی اسلامی تیوہار نہیں وہ مسلمانوں کا اپنا ایک رواج ہے۔ دورِ اول میں اس کا کوئی وجود نہ تھا۔ عرب ملکوں میں اب بھی اس قسم کا تیوہار نہیں منایا جاتا۔ یہ زیادہ تر ہندستان اور پاکستان میں منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر جلوس وغیرہ کے جو ہنگامے کئے جاتے ہیں وہ تو درست نہیں البتہ اگر

اس دن سیرت کے عنوان پر جلسہ کیا جائے اور پیغمبر اسلام ﷺ کا اُسوہ لوگوں کو بتایا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

۲۳۔ بی بی سی لندن سے ۳ مئی ۲۰۰۴ کو ایک ریڈیائی ڈسکشن کا پروگرام تھا۔ ایک صاحب (وسعت اللہ خاں) لندن سے بول رہے تھے، ایک صاحب (سید منور حسین) کراچی سے بول رہے تھے اور صدر اسلامی مرکز دہلی سے بول رہے تھے۔ موضوع تھا: دور جدید میں اجتہاد — تینوں ایک دوسرے کی آواز سن رہے تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ اجتہاد ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس کو کسی بھی حال میں موقوف نہیں کیا جاسکتا۔

۲۴۔ نئی دہلی کے جین ٹی وی (Jain TV) کے اسٹوڈیو میں ۴ مئی ۲۰۰۴ کی شام کو ایک ڈسکشن کا پروگرام ہوا۔ اس میں اینکر (Anchor) کے علاوہ دو آدمی شریک تھے، صدر اسلامی مرکز اور کانگریس کے سینئر لیڈر رسید جعفر شریف۔ اس کا موضوع انڈیا کے جنرل الیکشن مئی ۲۰۰۴ میں مسلمانوں کی انتخابی پالیسی تھا۔ موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ میں کسی سیاسی پارٹی کا ایڈوکیٹ نہیں۔ میرا ایک روحانی مشن ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان کس کو ووٹ دیں اور کس کو ووٹ نہ دیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان نگیٹیو ووٹنگ کو چھوڑ دیں اور پازیٹیو ووٹنگ کا طریقہ اختیار کریں۔ مسلم مسائل کو انتخابات کے ساتھ جوڑنا درست نہیں۔ الیکشن میں نیشنل انٹرسٹ کو سامنے رکھ کر اپنی پالیسی بنانی چاہیے۔ سید جعفر شریف نے اپنی تقریر میں صدر اسلامی مرکز کے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک بڑے عالم دین ہیں۔ ہم سب لوگ ان کے قدرداں ہیں۔ ان کو کسی ایک سیاسی حلقے سے جوڑنا صحیح نہیں۔ وہ سارے ملک کے لیے قابل احترام بزرگ ہیں۔

۲۵۔ الہدیٰ انٹرنیشنل کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے دبئی (عرب امارات) کا سفر کیا۔ یہ سفر ۵ مئی کو شروع ہوا اور ۱۰ مئی ۲۰۰۴ کو ختم ہوا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

۲۶۔ کشمیر نیوز سروس کے نمائندے مسٹر ماجد جہانگیر اور ان کے ساتھی ۱۳ مئی ۲۰۰۴ کو اسلامی مرکز میں آئے اور ٹیپ ریکارڈر پر صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات کا تعلق ان موضوعات سے تھا: اسلام، مسلمان، کشمیر، تعلیم۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ تعلیم میں ان کی پسماندگی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سب سے زیادہ توجہ تعلیم پر دیں۔

۲۷۔ کشمیر نیوز سروس (سری نگر) کی ٹیم مسٹر ماجد جہانگیر کی قیادت میں ۱۳ مئی ۲۰۰۴ کو مرکز میں آئی۔ انہوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کیا۔ ان کے سوالات کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کا مسئلہ خارجی نہیں داخلی ہے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ موجودہ زمانہ میں تعلیم میں پیچھے ہوگئے اسی سے ان کے تمام مسائل پیدا ہوئے۔ کشمیر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا کہ کشمیر کا مسئلہ کسی آئیڈیلزم کے تحت طے نہیں کیا جاسکتا۔

اس معاملہ میں لوگوں کو حقیقت پسند بننا ہوگا اور اس معاملہ میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ جغرافی اعتبار سے اس کا جو اسٹیٹس کو (status quo) بن گیا ہے اس کو مستقل حالت کے طور پر مان لیا جائے۔

۲۸۔ نئی دہلی کے میگزین لائف پوزیٹیو (Life Positive) کی خاتون ایڈیٹر مز سواتی چوپڑا (Swati Chopra) نے ۲۱ مئی ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انٹرویو کا موضوع موت تھا۔ یعنی اسلام میں موت کا تصور۔ یہ انٹرویو وہ اپنے میگزین کے خصوصی شمارہ میں شائع کریں گی۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کے مطابق، موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ وہ عارضی زندگی سے نکل کر ابدی زندگی میں داخل ہونا ہے۔ اسلام کے مطابق، موجودہ عارضی زندگی امتحان کے لیے ہے۔ امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد آدمی کو موت دی جاتی ہے تاکہ وہ اگلی زندگی میں اپنے عمل کے مطابق جنت یا جہنم میں داخل کیا جائے۔ مزید یہ بتایا گیا کہ موت کے ساتھ احتساب (accountability) کا تصور جڑا ہوا ہے۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ اس کو صرف ایک محدود مدت تک کی آزادی ہے۔ اس کے بعد وہ خدا کی عدالت میں اپنے عمل کا حساب دینے کے لیے حاضر کر دیا جائے گا۔ یہ تصور آدمی کے لیے برائی کے خلاف چیک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ صحیح زندگی گزارے تاکہ وہ ابدی زندگی میں کامیابی سے محروم نہ ہو۔

۲۹۔ نوئڈا کے اسپورٹس اینڈ کلچرل کلب (Sports and Cultural Club) میں ۲۱ مئی ۲۰۰۴ کو ایک ڈسکورس کا پروگرام ہوا۔ اس میں ایک سو کی تعداد میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تھا: مذہب کے دس آفاقی اصول۔ ہر مقرر کو دس منٹ کا وقت دیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ سوامی گوکل آنند نے ہندوازم کے دس اصول بتائے۔ فادر ڈومینیک امینول نے مسیحیت کے دس اصول بتائے۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلام کے دس اصول بتائے۔ یہ دس اسلامی اصول یہ تھے — انسانی اخوت، مذہبی ٹالرینس، صلح اور ایڈجسٹمنٹ، پڑوسی کو تکلیف نہ دینا، نرمی کا طریقہ، تواضع، لایعنی کام نہ کرنا، بڑے شر سے بچنے کے لیے چھوٹے شر کو گوارا کرنا، غصہ اور انتقام نہیں، پرامن طریقِ کار نہ کہ پرتشدد طریقِ کار۔ یہ پورا پروگرام انگریزی میں تھا۔ سامعین نے بہت زیادہ پسند کیا۔ سامعین میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے۔ تقریر کے بعد سوال و جواب ہوا۔ حاضرین کو اسلام کے موضوع پر چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی دی گئیں۔

۳۰۔ نئی دہلی کے مندا کنی انکلیو کے علاقہ میں این آر آئی کامپلیکس (N. R. I. Complex) میں ۲۳ مئی ۲۰۰۴ کو تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں صدر اسلامی مرکز کو تقریر کے لیے یہ عنوان دیا گیا تھا:

How to strike a balance between materialism and spirituality.

انہوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اسلام میں رہبانیت کا تصور نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مادی دنیا میں رہتے ہوئے روحانیت کو حاصل کیا جائے۔ اسلام میں روحانیت کا ذریعہ توسم ہے۔ یعنی مادی چیزوں سے روحانیت اور ربانیت کا سبق لینا۔ مادی تجربہ کو روحانی تجربہ میں کنورٹ کرنا۔ توسم کی اس صلاحیت کے لیے آدمی کو اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔

۳۱۔ مرکزی سیاسی لیڈر پرمود مہاجن کی رہائش گاہ (نئی دہلی) پر ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں زیادہ تر مسلم دانشور شریک ہوئے۔ اس کو مسٹر سدھیندر کلکرنی کی طرف سے آرگنائز کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع الیکشن اور مسلمان تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہندستانی مسلمان عام طور پر الیکشن کے موقع پر نگیٹیو ووٹنگ کرتے رہے ہیں۔ وہ انڈیا کی سیاسی پارٹیوں کو پرو مسلم اور اینٹی مسلم میں بانٹتے ہیں۔ یہ منفی سیاست مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس پر نظر ثانی کریں اور مثبت سیاست کا طریقہ اختیار کریں۔

۳۲۔ ۲۷ جون ۲۰۰۴ سے ایک نیا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ ہر دوسرے اتوار (alternate Sunday) کو صدر اسلامی مرکز دہلی سے ٹیلی فون پر خطاب کرتے ہیں جو امریکا (فلاڈلفیا) کے ایک اجتماع میں سُنا جاتا ہے۔ یہ پروگرام تقریباً دو گھنٹہ کا ہوتا ہے۔ ایک امریکی سامع کا خط یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

Respected Maulana Sahab,

Assalaamu alaykum

Our Spiritual Class every other Sunday with you over telephone is very spiritually elevating for us. We are all grateful to Allah (SWT) for making this happen so easily. We are exploring further how we can make this program accessible to many people all over the world. Make Du'a, it is surely poosible with Allah's help.

I think it is helpful to put this news in Al-Risala Urdu, and ask US subscribers to contact me at 215-240-4298.

۳۳۔ ستمبر ۲۰۰۴ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے مہاراشٹر کا سفر کیا۔ وہاں ناندیڑ اور پربھنی میں چند روز قیام کیا اور وہاں کے مسلمانوں سے بڑے پیمانہ پر ملاقاتیں کیں اور ان سے خطاب کیا۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۳۴۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) کی ایک ٹیم نے ۹ ستمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق اسلام میں فیملی پلاننگ سے تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ملک کی قومی

پالیسی کا مسئلہ ہے۔ اس طرح کے معاملات میں قومی پالیسی ہی مسلمانوں کی بھی پالیسی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ تعلیم میں پچھڑا پن ہے۔ بقیہ مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

۳۵۔ ۹ ستمبر ۲۰۰۴ کو دہلی میں وائس پریزیڈنٹ بھیروں سنگھ شیخاوت کی رہائش گاہ پر ایک خصوصی فنکشن ہوا۔ اس میں وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ، وائس پریزیڈنٹ بھیروں سنگھ شیخاوت اور ہوم منسٹر شیوراج پاٹل وغیرہ شریک ہوئے۔ اس فنکشن میں تین آدمیوں کو کمیونل ہارمنی کا ایوارڈ دیا گیا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر سبا راؤ تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موقع کی مناسبت سے کچھ کلمات کہے۔

۳۶۔ دینک بھاسکر (نئی دہلی) کے نمائندے مسٹر رجت کمار نے ۱۴ ستمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مسلم مسائل سے تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ تعلیم ہے۔ اگر مسلمانوں میں تعلیم پھیل جائے تو بقیہ تمام مسئلے اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔ تعلیم سے سمجھ آتی ہے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت سمجھداری کی ہے۔

۳۷۔ نئی دہلی کے زی نیوز (Zee News) کے اسٹوڈیو میں ۱۵ ستمبر ۲۰۰۴ کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ اس کے اینکر مسٹر یوسف انصاری تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع فیملی پلاننگ اور مسلمان تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ فیملی پلاننگ کا مسئلہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا تعلق ملکی حالات اور نیشنل پالیسی سے ہے۔ مسلمان حسبِ ضرورت اس کو اختیار کر سکتے ہیں۔

۳۸۔ ای ٹی وی (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو میں ۱۵ ستمبر ۲۰۰۴ کو ایک پینل ڈسکشن ہوا۔ اس کے اَینکر مسٹر جاوید نقوی تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع برتھ کنٹرول اور مسلمان تھا۔ ایک سوال کے جواب میں اُنہوں نے بتایا کہ قرآن اور حدیث میں برتھ کنٹرول کی کوئی ممانعت موجود نہیں۔ بلکہ صحیح البخاری اور دوسری کتابوں میں یہ روایات آئی ہیں کہ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عزل کرتے تھے اور ہمیں اس سے روکا نہیں گیا۔ عزل برتھ کنٹرول کا قدیم فطری طریقہ ہے۔ ایسی حالت میں برتھ کنٹرول کو ناجائز بتانا ایک بے دلیل بات ہے۔ اسلام میں پوپ ڈم یا برہمن وادنہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی طرف سے کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے۔

۳۹۔ انڈیا ٹی وی (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۵ ستمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس کے انٹرویور مسٹر کرشن موہن مشرا تھے۔ اس انٹرویو کا موضوع فیملی پلاننگ اور اسلام تھا۔ جوابات کے ذیل میں بتایا گیا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ وہ ہر نئی چیز کے بارہ میں فوراً منفی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ چنانچہ شروع شروع میں جب لاؤڈ اسپیکر آیا تو اس کو ناجائز بتایا گیا۔ یہی معاملہ برتھ کنٹرول کے ساتھ پیش آیا۔

حالاں کہ سادہ مسئلہ یہ ہے کہ حمل شدہ بچہ کو مارنا تو بلاشبہہ حرام ہے مگر مانع حمل تدبیر اختیار کرنا ہرگز حرام نہیں۔

۴۰۔ ہفت روزہ نئی دنیا (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر جمشید عادل نے ۲۱ ستمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر برتھ کنٹرول سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ قرآن کی بعض آیتوں کو لے کر لوگ برتھ کنٹرول کو ناجائز بتاتے ہیں۔ ان آیتوں کا کوئی تعلق برتھ کنٹرول کے مسئلہ سے نہیں۔ اسلام میں قتل اولاد یا اسقاط بلاشبہہ جائز نہیں مگر منع حمل کی پیشگی تدبیر کے بارے میں کوئی کھلی ممانعت قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہے۔

۴۱۔ سائی انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ۲۲ ستمبر ۲۰۰۴ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں انڈیا کے مختلف آرمی اسکولوں کے پرنسپل شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع کے مطابق انسانی اقدار (human values) پر اسلامی معلومات کی روشنی میں ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد سوال و جواب کا پروگرام ہوا۔ یہ پروگرام ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

۴۲۔ برٹش ہائی کمیشن (نئی دہلی) کی فرسٹ پولیٹکل سکریٹری جان کیلے (Joanne Caley) نے ۲۴ ستمبر ۲۰۰۴ کو صدر اسلامی مرکز سے ملاقات کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی گورنمنٹ یہ جاننا چاہتی ہے کہ انڈیا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اور اسی طرح باہر کے ملکوں میں مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان عناد (antagonism) کی جو فضا پائی جاتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے مولانا صاحب کا مشن کیا کام کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں انہیں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا اور مطالعہ کے لیے دو کتابیں دی گئیں:

1. True Jihad 2. Indian Muslims

انہوں نے توجہ سے باتوں کو سنا اور ان کو کاغذ پر نوٹ کیا۔ انہوں نے کافی دلچسپی کا اظہار کیا اور آئندہ دوبارہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

۴۳۔ فری لانس جرنلسٹ مزمتاز نے ۲۵ ستمبر ۲۰۰۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو نو بھارت ٹائمس نئی دہلی کے لیے تھا۔ سوالات کا تعلق فیملی کنٹرول اور خواتین کے معاملہ میں اسلامی تعلیمات سے تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلام کا موقف بتایا گیا۔

۴۴۔ ہندی روزنامہ دینک جاگرن کے نمائندہ ابتاب اگنی ہوتری نے ۹ ستمبر ۲۰۰۴ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ مذہب کی بنیاد پر مردم شماری کے بارے میں تھا۔ جوابات کا خلاصہ تھا کہ تمام مسئلوں کا مشترک حل یہ ہے کہ افزائش نسل یا برتھ کنٹرول کا اشو شریعت کا اشو نہیں ہے وہ نیشنل پلاننگ کا اشو ہے۔

۴۵۔ عارف، گڑیا اور توفیق کے مسئلہ پر ۲۱ ستمبر ۲۰۰۴ کو زی نیوز کے اسٹوڈیو میں ایک بڑا پروگرام ہوا۔

اس میں متمول خاندانوں کے لوگ اور علماء بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے بھی اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملہ میں شریعت کے فیصلہ کو تمام لوگوں کو مان لینا چاہیے۔

۴۶۔

Dear Respected Maulana Wahiduddin Khan,

Assalamaliekam, Pranams.

Namaste. Greetings from Badarikashrama, San Leandro, California,

While organizing Mahatma Gandhi Peace Prayer Day I happened upon the Al-Risala site in an internet search on peace and non-violence and the first thing I read was your article on non-violence, it impressed me tremendously and I struck up an email contact with Kaleem. I also asked him if it would be possible for you to come to our function on October 2 as it appeared that you would be in America at that time. It also appeared that you might be busy then as well, nevertheless I asked for permission to reprint your article in a booklet we are preparing to pass out on that day, Kaleem has also said that he would be mailing me some books to distribute on that day, even though Kaleem has told me that it would be fine to reprint your article. I will also ask your permission as I just now saw your email and would like to convey to you my respect and admiration for the work you are doing since it seems so necessary in today's interesting world that we speak and work for peace.

I am an American woman who has become a sanyasa and have just spent seven years in our Ashrama in Karnataka outside of Bangalore. I will return in January. I hope, inshaallah, that we might meet sometime in Brahata Desha if I ever have the opportunity to go to New Delhi or if you happen to come to Karnataka, perhaps if it would be alright. I could call and speak to you when you are in Philadelphia.

Yours in service,

Swami Mangalananda
Badarikashrama
15602 Maubert Avenue
San Leandro, CA 94578
Tel: 510-278-2444